پیلسیرٹ کا سفرنامہ ہندوستان

ترجمہ: ڈاکٹر مبارک علی

18- مزنگ روڈ لاہور

فون: 7249218-7237430

E-mail:FictionHouse2004@hotmail.com

نام کتاب : جہانگیر کا ہندوستان
مصنف : پیلسے رُٹ
ترجمہ : ڈاکٹر مبارک علی
پبلشرز : فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ، لاہور
فون:7249218-7237430
اہتمام : ظہور احمد خاں
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
سرورق : عباس
پہلا ایڈیشن : 1997ء
دوسرا ایڈیشن : 2001ء
تیسرا ایڈیشن : 2005ء
قیمت : -/90روپے

انتساب

محترم عبدالعزیز کے نام

جنھوں نے سیاسی مسائل پر ملک کے نامور دانشوروں اور سیاستدانوں سے بحث کی اور پھر ان سے مایوس ہو کر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمارے مسائل کا حل ہمیں ہی تلاش کرنا ہے۔

پیش لفظ

تاریخ اس وقت ہی سمجھ میں آتی ہے کہ جب بنیادی ماخذوں کا مطالعہ کیا جائے۔ اس لئے پیلسے رُٹ کی کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے تاکہ جہانگیر کے ہندوستان کے بارے میں آگہی ہو۔ جہانگیر کے بارے میں مختصر تعارف اس لئے لکھا گیا ہے کہ جنہوں نے مغل تاریخ نہیں پڑھی ہے وہ اس حکمراں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکیں۔ امید ہے کہ تاریخ کی ان کتابوں کی وجہ سے عام لوگوں میں تاریخ سے دلچسپی پیدا ہو گی اور ہم اپنی تاریخ کی روایات کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکیں گے۔

کتاب کا ترجمہ کرتے وقت اس چیز کو مد نظر رکھا گیا ہے کہ اسے عام فہم زبان میں کیا جائے۔ اس لئے وہ حصے اس میں شامل نہیں کئے گئے ہیں کہ جن کا تعلق ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی معلومات فراہم کرتا تھا۔ فٹ نوٹس کی جگہ آخر میں تشریحات میں چند اصطلاحات کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

فکشن ہاؤس ان کتابوں کی اشاعت میں جو تعاون کر رہا ہے وہ قابل تعریف ہے خاص طور سے اس ماحول میں کہ جہاں سنجیدہ کتابوں کا مطالعہ روز بروز کم ہو رہا ہے یہ ان کتابوں کی اشاعت سے علمی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

اپریل 1997ء لاہور

جہانگیر

(1605ء ----- 1627ء)

جہانگیر کے بارے میں مورخوں کی اتنی متضاد رائیں نہیں کہ جس قدر اکبر اور اورنگ زیب کے بارے میں ہیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی کہ اسے اکبر کے بعد ایک مستحکم اور پائدار سلطنت مل گئی کہ جس کے نظام میں ترتیب اور تنظیم تھی، اس لئے اسے اپنی ذہانت کو زیادہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی، سلطنت کی مشینیں حرکت کرتی رہی، اس کے کل پرزوں میں ابھی نیا پن تھا، اس لئے اس کی توانائی میں خستگی نہیں آئی۔ اسی لئے اس نے اپنی توجہ آرام اور عیش پر لگا دی۔ شکار کا شوق، شراب نوشی، آرنسنوں کی تصاویر سے لطف اٹھانا اور گرمیوں میں کشمیر کا سفر کرنا، اس کے محبوب مشاغل تھے۔

اکبر کا دیا ہوا نظام اس کے لئے بدقسمتی ثابت ہوا۔ وہ اُس زمانہ ساز اور ذہین حکمران کا جانشین بنا کہ جس کی یاد لوگوں کے دلوں سے جہانگیر کے پورے عہد میں محو نہیں ہوئی اور خود جہانگیر بھی توزک میں بار بار باپ کو یاد کرتا ہے۔ جب کرنے کو ہی کچھ زیادہ نہ تھا تو پھر وہ اپنی صلاحیتوں کو کہاں استعمال کرتا؟ اپنی اختراعات کو کیسے سامنے لاتا؟ وہ اس سایہ میں روپوش سا ہو گیا، شاید وہ خود اس سے اس قدر خوف زدہ رہا ہو کہ اس نے بھی اس سایہ سے نکلنے کی کوشش نہ کی۔ اگر اس میں صلاحیتیں تھیں تو وہ خوابیدہ ہی رہیں۔ اس کی ادبی صلاحیتیں ضرور اس کی توزک میں نمایاں ہیں۔ مگر اس میں بھی وہ اپنے بزرگ بابر جیسی رنگینی نہیں لا سکا، کیونکہ اس کی زندگی

بھی تو بابر جیسی نہیں تھی۔ مگر اس نے مغل شہزادوں کی روایات کو باقی رکھا' علم و ادب اور آرٹ سے ان کی دلچسپی کی روایات چلتی رہیں۔

اس کی پیدائش بڑے ارمانوں کے ساتھ ہوئی تھی (30 اگست 1589ء) اس لئے اکبر اس سے بڑی محبت کرتا تھا۔ ماں اس کی ایک راجپوت شہزادی تھی کہ جو مریم زمانی کے خطاب سے مشہور ہوئی' اس کے اصلی نام کے بارے میں مورخ خاموش ہیں۔ کچھ اسے جو وہ بائی بھی لکھتے ہیں ---- اگرچہ اس کا نام محمد سلطان سلیم تھا' مگر اکبر کے لئے یہ شیخو بابا تھا۔ جیسا کہ مغلوں میں دستور تھا' شہزادوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی' اور اس مقصد کے لئے کسی امیر کا بحیثیت "اتالیق" تقرر ہوتا تھا کہ جو شہزادے کی پوری پوری نگہداشت کرتا تھا' فارسی' ترکی اور ہندی زبانوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ جنگی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور نظم سلطنت و دربار کے آداب سکھائے جاتے تھے۔ جب یہ پندرہ سال کا تھا کہ اس کی منگنی بھگوان داس کی لڑکی مان بائی سے ہوئی۔ 1585ء میں بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی کہ جس میں دو کروڑ ٹنکہ کا مہر تھا۔

اس کے بعد راجپوتوں سے تعلقات بہتر کرنے کا جو سلسلہ چلا تو ایک کے بعد ایک راجپوت شہزادی حرم میں داخل ہوتی چلی گئی اودھے سنگھ یا موٹے راجہ کی لڑکی جودھ بائی اور رائے سنگھ بیکانیر کی لڑکی۔ اگلے دس سال میں اس نے 16 شادیاں کیں۔ اور یہ سلسلہ تخت نشینی کے بعد بھی جاری رہا۔

کہا جاتا ہے کہ کنیزوں کی تعداد ملا کر کل خواتین کی تعداد 300 تھی۔ تخت نشینی کے بعد اہم بیگمات میں جگت سنگھ کی لڑکی اور رام چندر بندیلہ کی لڑکی حرم میں داخل ہونے والیوں میں سے تھیں۔ اور پھر نورجہاں کہ جس نے اس کے دور حکومت کو ایک نئی شان دی اور وہ اس عشق میں اس قدر محو ہوا کہ اس کے لئے سلطنت و حکمرانی کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہی اور "ایک پیالہ شراب اور گوشت کا ایک ٹکڑا" اس کے لئے کافی ہو کر رہ گیا۔

مغلوں میں جانشینی کا کوئی رواج نہ تھا۔ مگر یہ ضرور کرتے تھے کہ کچھ اشارے ضرور دے دیتے تھے۔ اس مقصد کے لئے حصار فیروہ کی جاگیر تھی جسے یہ ملتی تھی سمجھا جاتا تھا کہ وہ وارث تخت و تاج ہو گا۔ اس کے علاوہ وہ دربار میں بادشاہ کے ساتھ رہتا تھا اور اسے سب سے بڑا منصب اور خطاب ملا کرتا تھا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ناز و نعم اور لاڈ پیار میں پلی اولاد اکثر نالائق ہو جاتی ہے۔ شاید یہ کچھ شہزادہ سلیم کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے اور اکبر کے تعلقات میں رنجش پیدا ہو گئی۔ باپ جس کو بیٹے سے بڑی امیدیں تھیں' وہ نالائق مصاحبوں کے ساتھ دوسرے راستہ پر جا رہا تھا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ جب 1591ء میں اکبر پر قولنج کا حملہ ہوا تو اسے شبہ ہوا کہ شاید سلیم نے حکیم حمام کے ساتھ مل کر اسے زہر دیدیا ہے۔ سلیم کو شبہ تھا کہ کہیں اکبر مراد کو اپنا جانشین نہ بنا لے۔ مگر وہ 1596ء میں کثرت شراب نوشی سے وفات پا گیا۔ اور یہی کچھ اس کے دوسرے بھائی دانیال کے ساتھ ہوا جو 1604ء میں اسی عادت کی وجہ سے مر گیا۔ ویسے تو اس کی راہ میں اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ لیکن ایک نیا امیدوار خود اس کے گھرانہ سے پیدا ہو گیا۔ اس کا بڑا لڑکا خسرو کہ جو بہت جلد دادا کا منظور نظر بن گیا اور خطرہ یہ ہوا کہ کہیں اسے نظر انداز کر کے خسرو کو تخت نشین نہ کر دیا جائے۔

اسی دوران میں سلیم نے باپ سے بغاوت کی' نہ صرف بغاوت بلکہ شاہانہ آداب کو اپنے دربار میں رائج کیا اور سب سے بڑھ کر اکبر کو جو صدمہ پہنچا وہ یہ کہ ابوالفضل کو 1602ء میں ایک سازش کے ذریعہ بیر سنگھ بندیلہ کے ہاتھوں قتل کرا دیا۔ یہ قتل اکبر کے لئے گہرے صدمہ کا باعث تھا' وہ بار بار ہاتھ مل کر کہتا تھا کہ شیخو یہ تم نے کیا کیا!

باپ اور بیٹے کی اس جنگ میں حرم کی خواتین بھی آ گئیں۔ سلیمہ سلطان بیگم اور مریم مکانی نے مل کر دونوں میں صلح کرائی۔ اٹاوہ سے سلیم نے معافی کا خط لکھا اور 1603ء میں آ کر باپ سے ملا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ مگر جب اکبر نے اسے میواڑ کی

مہم پر روانہ کیا پھر دماغ میں بغاوت سمائی اور دوبارہ سے آزادانہ طور طریق اختیار کر لئے۔ اکبر اس کے خلاف روانہ ہونا چاہتا تھا' مگر ماں کی بیماری اور وفات کی وجہ سے رک گیا۔ اسی وقت شہزادہ خسرو بحیثیت امیدوار کے زور پکڑ گیا۔ ان حالات میں سلیم نے سوچا کہ اگر دربار سے دور رہا تو اس کے مواقع بالکل ختم ہو جائیں گے۔ اس لئے 1604ء میں واپس آگرہ آیا۔ اکبر نے نظر بندی کا حکم دیا۔ بطور سزا اس کی شراب بند کر دی' اور اس کے ساتھیوں کو سزائیں دیں۔ مگر اس بار پھر حرم کی خواتین سفارش لے کر آئیں اور اسے قید سے نجات دلائی۔

زندگی کے ان آخری دنوں میں اکبر نے پے در پے یہ صدمات برداشت کئے اور پھر جو بیمار ہوا تو دوبارہ سے بستر سے نہ اٹھ سکا۔ 1605ء میں اس کی وفات ہوئی' اور اسی کے ساتھ جہاں گیر تخت نشین ہوا۔ شخصیات بدلتی رہتی ہیں' بادشاہت جاری رہتی ہے۔ تخت خالی نہیں رہتا ہے' کوئی امیدوار ذہانت و صلاحیت سے نہیں بلکہ خاندانی نام کے رعب سے قانونی طور پر بادشاہ ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ بادشاہ خدا کا سایہ ہے عوام کو اس سائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ سایہ نہ ہو تو آفات کی تمازت سے انہیں کون پناہ دے گا۔

اس کی تخت نشینی پر وقتی طور پر تو سب ہی راضی ہو گئے' مگر خسرو کی بادشاہت کی خواہشات ختم نہیں ہوئیں تھیں ایک دن وہ قید سے بھاگ نکلا اور بغاوت کر دی۔ اس نے اپنے باپ کی پیروی کی جس نے اپنے باپ کو صدمہ پہنچایا تھا۔ مگر اکبر کی بنائی سلطنت بڑی مضبوط تھی۔ اس نے اس بغاوت کے اثرات کو جھیل لیا۔ خسرو کو ناکامی ہوئی۔ ایک بار کابل میں اور سازش کی وہ بھی ناکام رہی۔ اس جرم میں بینائی سے محروم ہوا۔ تاکہ نابینا شخص تخت پر نہ بیٹھ سکے اور اس کی مستقبل کی خواہشات ختم ہو جائیں۔ خسرو کا انجام بھی دردناک ہی ہوا۔ پوری زندگی قید میں گذاری۔ پھر اپنے ہی بھائی شہزادہ خرم کے ہاتھوں قتل ہوا۔ تخت و تاج کے آگے کوئی بھائی بند نہیں ہوتا ہے۔ جب اقتدار کی بات آئے تو انسانی رشتہ اقتدار کے ٹھنڈے پانی میں دم توڑ دیتے

ہیں۔

جہاں گیر کی بادشاہت کا اہم واقعہ اس کی نورجہاں سے شادی ہے (1611ء) اس وقت نورجہاں کی عمر 34 سال کی تھی۔ اس کا اصلی نام تو مہرالنساء تھا' مگر اسے شادی کے بعد بادشاہ بیگم اور پھر نورجہاں کے خطابات ملے۔ اس کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ کیا اس نے شیرافگن کو اس لئے قتل کر دیا تھا؟۔ دل کا حال کون جانے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اس کے عشق میں اس نے سلطنت کو بھی بھلا دیا' نورجہاں سے کیا شادی ہوئی' اس کا پورا خاندان مغل سلطنت میں اس طرح اقتدار میں آیا کہ دوسرے تمام خانہ زاد خاندان پر چھا گیا۔ نورجہاں نے دربار کی زندگی کو بدل دیا۔ اس میں اور زیادہ نظم و ضبط اور رنگینی آگئی۔ مگر اقتدار کی خواہشات نے کئی مخالف بھی پیدا کئے۔ ابتداء میں نورجہاں اور شہزادہ خرم میں دوستی تھی۔ پھر یہ دوستی دشمنی میں بدل گئی۔ اور اس نے سوچا کہ خرم کی جگہ شہریار کو جانشینی کے لئے آگے بڑھائے۔ اس کی شادی نورجہاں کی لڑکی لاڈلی بیگم سے ہو چکی تھی (1620ء) آصف خاں کی لڑکی کی شادی ارجمند بانو کی شادی خرم سے تھی۔ بات بڑی پیچیدہ تھی۔ جنگ اب دو خاندانوں میں تھی۔ جہاں گیر اپنی شراب نوشی اور بیماری کی وجہ سے اس قابل نہیں تھا کہ حالات پر قابو پا سکتا۔ اس لئے جب 28- اکتوبر 1627ء کو اس کی وفات ہوتی ہے تو سلطنت اندرونی سازشوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اس سازش میں نورجہاں ناکام رہتی ہے اور اس کا بھائی آصف خاں اپنے داماد کو بادشاہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد نورجہاں 18 سال تک زندہ رہی' مگر اس نے سیاست کو خیرآباد کہہ کر اپنی بقایا زندگی خاموشی' رضا و صبر کے ساتھ بسر کی۔

جہاں گیر نے اپنے دور حکومت میں کوئی بڑا کارنامہ تو سرانجام نہیں دیا۔ مگر اس نے نہ صرف اکبر کی سلطنت کو باقی رکھا بلکہ اس کی صلح کل کی پالیسی کو بھی جاری رکھا۔ وہ پالیسی کہ جس میں مذہبی رواداری اور قوت برداشت تھی۔ اب یہ اس کے جانشینوں کا کام تھا کہ وہ اس روایت کو باقی رکھیں یا ختم کریں۔

تعارف

یورپی اقوام ہندوستان اور ایشیا کے دوسرے ملکوں میں مصالہ جات کی تجارت کی غرض سے آئیں۔ اکثر مصالے جنوب مشرقی ایشیا کے علاقوں میں تھے اور کچھ جنوبی ہندوستان میں ملتے تھے۔ ان ملکوں میں مصالہ جات حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ مصالوں کے علاوہ ہندوستان سے جو اشیاء یہ در آمد کرتے تھے ان میں کپڑا' شورہ' اور تیل قابل ذکر ہیں۔

جو یورپی اقوام ہندوستان میں آئیں' ان میں سب سے پہلے آنے والے پرتگیزی تھے' پھر ڈچ' فرانسیسی' انگریز' اور دوسرے چھوٹے یورپی ملکوں کے تاجر تھے۔ ابتداء میں ان کا ایک مقصد تھا کہ کسی طرح سے سستا مال خریدا جائے اور اسے یورپ کی منڈیوں میں مہنگا فروخت کر کے منافع کمایا جائے۔ ہندوستان میں اپنے مال پر ڈیوٹی کی کمی یا معافی ان کا خاص مقصد ہوتا تھا۔ اس لئے یہ مغل بادشاہوں کے دربار میں سفارش' اور رشوت دے کر مراعات کا فرمان حاصل کرتے تھے۔ ان یورپی اقوام کی آپس میں رقابتیں بھی تھیں یہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے اور بدنام کرنے کے مختلف طریقوں کو استعمال بھی کرتے تھے۔ انہیں رقابتوں کا نتیجہ تھا کہ پرتگیزیوں کی اجارہ داری آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی اور ان کی جگہ فرانسیسیوں' ڈچوں' اور انگریزوں نے لے لی۔

ڈچ ہندوستان میں 1602ء میں آئے۔ اس وقت ہندوستان کے تاجر جنوب مشرقی ایشیا سے کپڑے کے بدلے میں مصالہ جات لاتے تھے۔ ہندوستانی کپڑے کی اہمیت اور فروخت کو دیکھتے ہوئے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ملازمین سے کہا کہ یہ ان کے

لئے منافع بخش ہو گا کہ اگر وہ نقد ادائیگی کے بعد ہندوستان سے کپڑا خریدیں اور پھر اسے جنوب مشرقی ایشیا میں بیچ کر اس کی آمدن سے مصالہ جات حاصل کریں اس سے ان کا نقد پیسہ بچ جائے گا اور اس سے منافع بھی زیادہ ہو گا۔ ان دونوں علاقوں میں تجارت کی غرض سے ڈچوں نے 1606ء میں جنوبی ہندوستان میں شمالی کارومنڈل میں پیٹاپول کے مقام پر اپنی تجارتی کوٹھی قائم کی۔ بعد میں جب تجارت کو فروغ ہوا تو 1608ء میں جنوبی کارومنڈل میں پالیار کے مقام پر اور 1660ء میں پولی کٹ کے مقام پر دو تجارتی کوٹھیاں اور تعمیر کیں۔ ان فیکٹریوں یا تجارتی کوٹھیوں کو ملا کر انہوں نے ہندوستان میں ایک گورنمنٹ کی تشکیل دی اور ان کی نگرانی اور انتظام کے لئے گورنر کا تقرر کیا۔

جب ہندوستان میں کپڑے کی زیادہ مانگ ہوئی تو انہوں نے ان علاقوں میں بھی اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں کہ جہاں کپڑا تیار ہوتا تھا۔ ان میں کھمبے' بھڑوچ اور آگرہ قابل ذکر ہیں۔

آگرہ کی فیکٹری ہی میں ڈچ فیکٹر پیلسے رُٹ آیا تھا۔ جیسا کہ انگریزی تعارف میں بتایا گیا ہے کہ اس کی آمد کا مقصد ڈچ تجارت کو فروغ دینا تھا۔ ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران اس نے جو رپورٹ لکھی۔ اگرچہ اس کا تعلق تجارتی معاملات سے ہے۔ مگر اس میں جہانگیر کے عہد کے بہت سے واقعات ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس نے اس وقت کی سماجی زندگی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت ہے۔

چونکہ درباری مورخ اور واقعہ نویس صرف تعریفیں لکھتے ہیں۔ اس لئے پیلسے رُٹ کے مشاہدات میں جو عام لوگوں کی زندگی کے بارے میں مواد ملتا ہے اس سے ہماری تاریخیں خالی ہیں۔ اس رپوٹ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کا معاشرہ بھی آج کی طرح امیر و غریب کے طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ رشوت' بدعنوانیاں' ناجائز طریقوں سے دولت اکٹھی کرنا اس وقت بھی حکمران طبقوں کا کام تھا۔ غریبوں کے طرز

زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغل سلطنت کی شان و شوکت اور دولت محلات و حویلیوں سے اتر کر جھونپڑیوں تک نہیں آئی تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں غربت' مفلسی اور محرومی ہو گی وہ محروم لوگ توہمات میں پناہ لیں گے' اس لئے آج کی طرح ماضی میں بھی مزار لوگوں کی زیارت کا مرکز تھے کہ جہاں وہ نہ پوری ہونے والی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے منتیں مانتے تھے۔

اس لئے ذہن میں یہ سوال بھی آتا ہے کہ کیا ہماری تاریخ کا۔ تسلسل آج بھی اسی طرح سے برقرار ہے کہ جیسا یہ ماضی میں تھا؟ اس رپورٹ کے بہت سے حصوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ باتیں جہانگیر کے عہد کی نہیں بلکہ ہمارے زمانے کی ہیں۔ تو کیا تاریخ کے اس پورے سفر میں ہمارا معاشرہ ایک ہی جگہ ٹھہرا رہا ہے یا اس میں کوئی تبدیلی بھی آتی ہے؟ اس میں امراء کی دولت مندی' دولت کی دکھاوٹ کے طریقے' رعونت' اور بدعنوانیوں کے جو تذکرے ہیں' دیکھا جائے تو آج کے حالات میں صرف ماحول بدلا ہے' ورنہ فرق کوئی نظر نہیں آتا ہے۔

اس رپورٹ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جس وقت اہل یورپ ہمارے معاشرہ کو جاننے اور سمجھنے میں مصروف تھے' اس وقت بھی ہم یورپ اور اس کے معاشرے سے ناواقف تھے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ یورپی علماء و فضلاء آکر ہمیں ہماری تاریخ' اور روایات و اداروں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ تو دور کی بات ہے کہ ہم اہل یورپ کو ان کے بارے میں کچھ بتائیں۔ اکثر تو ہم اس پر بھی خوش ہو جاتے ہیں کہ "ہماری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی" اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب اس خودکشی کی خبر آتی ہے۔

اب چونکہ یورپ جانا زیادہ مشکل نہیں رہا ہے۔ اس لئے لوگ یورپ کے سفر نامے بہت لکھنے لگے ہیں' مگر ذرا مقابلہ کیجئے اس سترہویں صدی کے یورپی مسافر کے مشاہدات اور تاثرات کا اور ہمارے آج کے سیاحوں کا کہ جنہیں یورپ میں سوائے

لڑکیوں اور محبوباؤں کے اور کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ ان سفرناموں کو پڑھ کر نہ تو یورپ کے بارے میں کچھ پتہ چلتا ہے اور نہ ان کے معاشرے کے بارے میں۔ یہ سفرنامے پیسہ کمانے کے لئے ہوتے ہیں۔ علم دینے کے لئے نہیں۔

غیرملکی سیاحوں کے بیانات کو آنکھیں بند کر کے قبول بھی نہیں کرنا چاہئے' کیونکہ یہ سیاح اپنے ملک کی تہذیب و روایات کے اس قدر عادی ہوتے ہیں کہ انہیں دوسرے معاشروں میں یہ چیز اجنبی اور بری لگتی ہے۔ ان کے اپنے تعصبات اپنی جگہ' مگر ان کے ہاں وہ مشاہدات بھی مل جاتے ہیں کہ جنہیں ہماری نظریں نہیں دیکھتی ہیں۔

ایک خاص بات جو ان غیر ملکی سیاحوں کے ہاں نظر آتی ہے وہ بازار کی افواہیں اور گپیں ہوتی ہیں۔ مگر ان افواہوں کی بنیاد کچھ حقائق پر ہوتی ہے اور جب یہ عوام تک آتے ہیں تو ان میں لطف اندوزوں کے لئے رنگ بھر دیئے جاتے ہیں۔ مگر ان سے حکمران' امراء اور حکومت کے بارے میں عوام کے جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ یہی ان کی اہمیت ہے۔

پیلسے رُٹ کے یہ مشاہدات نہ صرف ماضی کو بلکہ ہمارے حال کو بھی سمجھنے میں مدد دیں گے۔

دیباچہ

(مترجم انگریزی)

فرانسکو پیلسے رُٹ، جو کہ فرانسیسی زبان میں فرانسو پیل سارٹ کے تلفظ سے جانا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ کو جو ہندوستان کے بارے میں ہے ان محققین نے استعمال کیا ہے کہ جنہوں نے مغل ہندوستان پر تحقیق کی ہے۔ ان میں ڈی لائیٹ سے لے کر آخر زمانہ تک مصنفین شامل ہیں۔ لیکن جہاں تک میرا علم ہے اس کی رپورٹ مکمل شکل میں اب تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب آج سے تین صدیوں قبل اس رپورٹ کو ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کیا گیا تو انہوں نے اس کو اس لئے شائع کرنے سے گریز کیا کیونکہ اس میں ان کے تجارتی رازوں کے افشا ہونے کا خطرہ تھا۔ اس رپورٹ کے لکھنے کے 40 سال بعد جب کہ تجارتی صورت حال بدل گئی تھی تو اس وقت مسٹر تھیونو (Thevont) نے اپنے سفر نامہ میں جو پیرس سے 1663ء میں شائع ہوا تھا۔ اس رپورٹ کے کچھ حصے نقل کئے تھے۔ انہیں حصوں کو بعد میں کچھ اور لوگوں نے یہاں سے نقل کر کے اپنی کتابوں میں شائع کیا۔ تھیونو جو کہ فرانسیسی تجارتی مفادات کے لئے کام کر رہا تھا۔ اس نے صرف انہیں حصوں کو نقل کیا کہ جو اس کے نقطہ نظر سے ضروری تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو یہ رپورٹ نامکمل شکل میں ملی ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ رپورٹ کے جن حصوں کو اس نے قابل اعتنا نہیں سمجھا، تاریخ کے طالب علموں کے لئے وہی سب سے زیادہ اہم ہیں۔

اس وقت قارئین کے ہاتھوں میں جو انگریزی ترجمہ ہے (اسی سے اردو ترجمہ کیا گیا ہے) وہ اس مسودے سے لیا گیا ہے کہ جو دی ہیگ رجسکس آرشیف' یعنی رجسکس آرکائیوز میں موجود ہے۔ بنیادی طور پر یہ رپورٹ ایک تجارتی دستاویز ہے۔ لیکن آنے والی نسلوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس نے ان سماجی اور انتظامی سرگرمیوں اور ماحول کا ذکر کیا ہے کہ جن میں تجارت ہوا کرتی تھی۔ جن قارئین کو اس سے دلچسپی نہیں کہ تیل کی پیداوار کیسے ہوتی تھی؟ یا مصالہ جات کی تجارت کی کیا اہمیت تھی یا وہ ان موضوعات کو چھوڑ کر ان ابواب کو پڑھ لیں کہ جن میں انتظامی امور' معیار زندگی' اور لوگوں کے سماجی و مذہبی رسومات کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

اس ترجمہ کا ایک ایک جملہ پروفیسر گیتل نے دیکھا ہے' جو کہ ڈچ زبان کے ماہر ہیں اور اوریجنل متن کے بارے میں جن کی رائے حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن وہ تعارف' حاشئے اور اشاریہ کے سلسلہ میں قطعی ذمہ دار نہیں ہیں میں رجسکس آرشیف کے ڈاکٹر دو ہولو کا شکر گذار ہوں کہ جنھوں نے میری درخواست پر اس مسودے کو تلاش کیا۔ میں مسٹر بجلسما (Bijlsma) جو کہ اب نوآبادیاتی دستاویز کے انچارج ہیں۔ ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں ان حوالہ جات کو فراہم کیا کہ جس کی بنیاد پر اس کتاب کا تعارف لکھا گیا۔ میں مسٹر آر۔ برن کا بھی شکر گذار ہوں کہ جنھوں نے مقامی امور کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ اس کے علاوہ میں ان دوستوں کا بھی مشکور ہوں کہ جنھوں نے اس کتاب کے نوٹس لکھنے میں مدد دی ان کے نام' ان کی فراہم کردہ معلومات کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔

ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ۔

تعارف

اس رپورٹ کے مصنف کا مختصر مگر شاندار کیریر ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزات سے حاصل کیا گیا ہے۔ فرانسکو پیلسے رُٹ جو کہ ایسٹ ورب کا رہنے والا تھا۔ اس نے 1618ء میں کمپنی کے تجارتی شعبہ میں بحیثیت نائب یا اسسٹنٹ کے جو کہ سب سے نچلا عہدہ تھا' مشرق کا سفر کیا۔ 1620ء میں اسے دوبارہ سے کمپنی کی ملازمت میں لیا گیا اور اس کا عہدہ بڑھا کر اسے جونیر فیکٹر بنا دیا گیا۔ اس بار اس کی تقرری ہندوستان میں ہوئی۔ وہ اسی سال دسمبر میں سورت کی بندرگاہ پر پہنچا۔ جہاں سے اسے فوراً ہی آگرہ کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پر وہ 1627ء تک رہا اور اس عرصہ میں اس کا عہدہ بڑھا کر اسے سینئر فیکٹر بنا دیا گیا۔

اپنی تقرری کی مدت پوری کرنے کے بعد وہ ہالینڈ واپس آ گیا۔ یہاں وہ جون 1628ء میں پہنچا' لیکن یورپ میں اس کا قیام مختصر رہا اور اسے دوبارہ سے کمپنی کی ملازمت میں لے لیا گیا اس بار اسے اکتوبر میں بٹاوا نامی جہاز کے ذریعہ جاوا روانہ کر دیا گیا۔ اس زمانہ میں جہاز کی کمانڈ' کمپنی کے کسی تجارتی عہدے دار کو دی جایا کرتی تھی' لہٰذا بٹاویا جہاز کی کمانڈ اس بار اسے مل گئی۔ بعد میں اسے جہازوں کے اس فلیٹ کا صدر مقرر کر دیا گیا کہ جس کا ایک جہاز بٹاویا تھا۔

یہ سفر تباہ کن رہا۔ بٹاویا شمال کی جانب ہوتا ہوا گیا یہاں تک کہ آسٹریلیا کے مغربی ساحل پر ایک جزیرہ کے قریب یہ حادثہ کا شکار ہو گیا۔ یہاں سے پیلسے رُٹ نے ایک کشتی کے ذریعہ جاوا کا مہم جویانہ سفر کیا۔ بٹاویا کے جزیرہ پر بحفاظت پہنچ کر وہ امدادی جہاز لے کر واپس پلٹا۔ جہاں اس وقت تک خطرناک قسم کی بغاوت پیدا ہو چکی

تھی۔ باغیوں کے ساتھ سختی کا سلوک کرتے ہوئے وہ انہیں اور جہاز کے دوسرے عملے کو بحفاظت بٹاویا لے آیا' جہاں یہ دسمبر 1629ء میں پہنچے۔ جہاز کی اس تباہی کی اپنی ایک علیحدہ سے کہانی ہے۔ جس کا کافی مواد ڈچ زبان میں موجود ہے۔ اس سفر کی روداد ڈچ رسالوں میں ایک بار سے زائد چھپی' جبکہ اس کی تلخیص تھیونو کے سفرنامہ میں شامل ہے۔ جس کی وجہ سے پیلسے رُٹ کی شہرت بحیثیت نیل کی پیداوار کے ماہر یورپ کے تجارتی حلقوں میں پھیل گئی۔ پچھلی صدیوں میں مشرق کے بارے میں جو سفرنامے اور مہماتی واقعات شائع ہوئے ہیں ان میں اس ڈچ ملاح کا نام بھی شامل ہے۔(1)

دسمبر 1629ء میں پیلسے رُٹ نے جو خط لکھا ہے اس میں اپنی صحت کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ جو طویل سفر اور تھکن کی وجہ سے بے انتہا متاثر ہو گئی تھی۔ آنے والے سال اپریل کے مہینہ میں اسے سماترا میں جانے والی ایک مہم میں سکنڈ۔ ان۔ کمانڈ بنا دیا گیا تھا۔ وہ جون کے مہینہ میں واپس بٹاویا آیا اور ستمبر کے مہینہ میں اس کی وفات ہو گئی۔ مرنے سے پہلے کمپنی کے ڈائرکٹرز نے اسے انڈیا کی کونسل کا خصوصی رکن نامزد کر دیا تھا' لیکن بدقسمتی سے اس تقرری سے پہلے ہی اس کی موت واقع ہو گئی' کیونکہ ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے کہ اس نے بحیثیت خصوصی رکن کے کونسل میں کام کیا ہو۔

اس سفرنامہ یا رپورٹ میں' اس نے اپنے سات سالوں کے تجربات اور مشاہدات کے بارے میں لکھا ہے کہ جو اس نے آگرہ کے قیام کے دوران کئے تھے یہ وقت ڈچ کمپنی اور اس کی ہندوستانی تجارت کے سلسلہ میں انتہائی اہم وقت تھا۔ کمپنی نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ مغربی ہندوستان میں تجارت کے سلسلہ میں اپنے قدم جمائے' مگر اس کی یہ کوشش زیادہ بار آور نہیں ہوئیں' اور اس نے 1607ء میں اس منصوبے کو ختم کر دیا۔ لیکن بعد میں بٹاویا میں کمپنی کے عہدے داروں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے لئے گجراتی کپڑوں اور ٹیکسٹائل کی اشیاء انتہائی اہم ہیں۔ لہٰذا اپنی

تجارتی سرگرمیوں کو شروع کرنے کی غرض سے انہوں نے دوبارہ 1616ء میں سورت میں اپنی تجارتی کوٹھی قائم کی۔ مگر کچھ سالوں تک انہیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر 1620ء کے آواخر میں مشہور پیٹر فان بروکے بحیثیت ڈائریکٹر کے سورت میں آیا۔ اس وقت اس کی نگرانی میں شمالی و مغربی ہندوستان' ایران' اور عرب کے علاقے تھے جنہیں اس وقت کی اصطلاح میں "مغربی علاقے" کہا جاتا تھا۔ اس کے آنے کے بعد اس کی صلاحیت و قابلیت کی وجہ سے سات سال کے اندر اندر اس نے تجارت میں انگریز تاجروں پر برتری حاصل کر لی' حالانکہ یہ ڈچ کمپنی سے پہلے ان علاقوں میں تجارت کر رہے تھے۔(2)

ڈچ کمپنی نے جن مقاصد کے ساتھ اپنے اثر و رسوخ کو بڑھایا ان میں سب سے پہلا مقصد تو یہ تھا کہ گجرات سے بنا ہوا کپڑا کیسے حاصل کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے آگرہ میں جو تجارتی کوٹھی قائم کی' اس کی دو اہم وجوہات تھیں۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ کوئی بھی یورپی قوم جو ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئی تھی وہ نیل کی تجارت کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی' اور سب سے اچھی نیل کی پیداوار آگرہ کے وسط و نواح میں ہوتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ڈچ کمپنی کی تجارت کا انحصار مسالوں کی برآمد پر تھا۔ اسی کو فروخت کر کے وہ منافع کماتے تھے اور پھر اسی پیسہ سے مزید خرید و فروخت کرتے تھے۔ اس لئے آگرہ ان کے لئے ضروری تھا' کیونکہ یہ مغل سلطنت کا مرکز تھا اور بادشاہ کا دربار بھی یہیں تھا۔ اس کے علاوہ آگرہ کی شہرت اس وجہ سے بھی تھی کہ یہاں مصالہ جات کی وسیع منڈی تھی جو ہندوستان بھر کو سپلائی کرتی تھی۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جنوری 1621ء میں فان ڈین بروکے نے ہیوٹن (Heuton) اور پیلسے رٹ کو عصہ چند لوگوں کے ساتھ آگرہ بھیجا تھا۔ ان دو فیکٹروں میں سے اول الذکر تو دو سال کے اندر اندر مر گیا' اگرچہ مجھے اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملیں کہ اس کا جانشین کون ہوا؟ لیکن اس زمانہ میں انگریز تاجروں کے خطوط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فان۔ ڈین۔ بروکے پیلسے رٹ کو

اس کا سب سے مناسب جانشین سمجھتا تھا' اس لئے خیال یہی ہے کہ اس کے بعد سے وہی آگرہ کی تجارتی کوٹھی کا انچارج رہا ہو گا۔(3) لیکن اس کی تجارتی مصروفیات کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں ملتی ہیں' اس نے ہندوستان کے مقامات کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس سے اس کی ذہانت اور مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے وہ خشکی کے راستے پٹم سے سورت اور سورت سے آگرہ گیا۔ آگرہ تک کا سفر اس نے غالباً مشرقی شاہراہ پر کیا ہو گا' کیونکہ برہانپور کے بارے میں جو تفصیلات دی گئی ہیں وہ اس کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں' اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس نے اجمیر جانے والے راستے کے کسی شہر یا مقام کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگرہ سے زیادہ دور نہیں گیا۔ شاید الہ آباد تک بھی نہیں۔ لیکن دوسری طرف اس نے کشمیر تک کا سفر کیا' کیونکہ یہاں اس وقت بادشاہ کا قیام تھا اور وہ دربار سے تجارت کے سلسلہ میں رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ اس سفر کے دوران وہ لاہور بھی گیا' کیونکہ اس نے کشمیر جانے کے لئے اسی راستہ کو اختیار کیا کہ جس پر بادشاہ نے سفر کیا تھا۔ ان کے علاوہ آگرہ سے اس کی غیر حاضری کبھی نہیں رہی۔ سوائے ان موقعوں کہ جب وہ نیل کی خریداری کے سلسلہ میں بیانہ کے گرد و نواح میں جاتا رہا۔

جہاں تک اس کے کام کا تعلق ہے' اس کا اظہار واقعات کے بیان سے ہوتا ہے۔ جب وہ ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ آگرہ آیا ہے تو اس وقت ڈچ تجارت ناگفتہ بہ حالت میں تھی' مگر جب اس نے شہر چھوڑا ہے تو' تمام مالی مشکلات کے باوجود نیل کی تجارت پر ڈچ اپنی برتری قائم کر چکے تھے۔ پیلسے ٹرٹ کی خدمات کا اندازہ فان۔ ڈین۔ بروکے' کے اس خط سے ہوتا ہے کہ جو اس نے 16 دسمبر 1627 کو کمپنی کے ڈائریکٹرز کو لکھا تھا۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ اسے خوشی ہو گی اگر سینئر فیکٹر پیلسے ٹرٹ کی خدمات کو کمپنی اپنے مفادات کے لئے زیادہ استعمال کر سکے۔ کیونکہ ملازمت کے دوران اس نے جن صلاحیتوں اور تجربوں کا اظہار کیا ہے' وہ قابل فخر ہیں۔ اس کے علاوہ آگرہ میں جو زبان بولی جاتی ہے' اس پر بھی اسے کلی مہارت ہے۔

اس کی کامیابی کی دلیل یہ ہے کہ بحیثیت اسسٹنٹ' تقرری کے گیارہ سال بعد اسے کونسل کا خصوصی رکن بنا لیا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈائریکٹرز اس کے کام سے کس قدر مطمئن تھے۔ اس کے بارے میں ڈائریکٹرز کی رائے ایک تو اس کی یادداشتوں پر اور دوسرے ان زبانی رپورٹس پر مبنی ہو گی کہ جو اس نے ہالینڈ کے قیام کے دوران انہیں فراہم کی ہوں گی۔ اس لئے اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ پیلسے رُٹ ایک کامیاب ایجنٹ اور کمپنی کا ملازم تھا کہ جس پر ڈائریکٹرز کو پورا پورا اعتماد تھا۔ اس کے کام کے علاوہ اس کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں مجھے صرف ایک اشارہ ملا ہے۔ اس کی موت کے کچھ عرصہ بعد آگرہ میں ڈچ کمپنی میں بدعنوانیوں کے بارے میں ایک تحقیق ہوئی تھی۔ اس میں جہاں کمپنی کے دوسرے ملازمین کی غیراخلاقی حرکات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں پیلسے رُٹ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بھی ان عادتوں میں ملوث تھا(4) جہاں تک پیلسے رُٹ کے نقطہ نظر کا تعلق ہے تو یہ فیصلہ اس کی غیرموجودگی میں ہوا۔ لیکن خود اس کی یادداشتوں میں ایسی عبارت ہے کہ جس سے قارئین خود یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آگرہ کے اس وقت کے ماحول سے وہ خود کو اس سے جدا نہیں کر سکتا تھا۔

II

جیسا کہ یادداشتوں کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ 1626ء میں لکھی گئیں تھیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ آگرہ میں اس کا کام ختم ہو رہا تھا۔ حقیقت میں یہ ایک تجارتی رپورٹ ہے جو کہ کمپنی کے استعمال کے لئے تیار کی گئی تھی نہ کہ عام لوگوں کے لئے۔ کیونکہ اس میں جس قسم کی اطلاعات ہیں۔ وہ یقیناً دوسری رقیب کمپنیوں کو مہیا نہیں کی جا سکتی تھیں۔ جان ڈی۔ لائٹ کو اس رپورٹ کا صرف وہ حصہ دکھایا گیا کہ جس کا تعلق لوگوں کے معیار زندگی سے تھا' اسی حصہ کو اس نے اپنی کتاب جو مغلوں کی سلطنت اور انتظام سلطنت پر ہی لکھی' اس میں استعمال کیا ہے۔ اس کی یہ

کتاب 1631 میں چھپی تھی۔(5) اس کے علاوہ اس کتاب کے بارے میں مجھے کوئی حوالہ نہیں ملا' یہاں تک کہ 1663ء میں تھیونو نے اس کا اختصار اپنی کتاب میں شائع کیا۔ اس کے بعد سے اس کتاب کا تذکرہ تھیونو کے حوالہ سے ہی ہوتا رہا۔ کسی نے اس اصل مسودہ کی طرف توجہ نہیں دی۔

اس کتاب کا موجودہ ترجمہ اس مسودہ سے کیا گیا ہے کہ جو ر جکس آر شیف میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کسی اور نقل کے بارے میں کسی سے نہیں سنا ہے۔ یہ مسودہ جیسا کہ اس کی ہاتھ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے کسی ہم عصر نے لکھا تھا۔ طرز تحریر کی بنیاد پر مسٹر بلجس مانے یہ رائے ظاہر کی کہ یہ لومن نامی ایک جونیئر فیکٹر کا لکھا ہوا ہے کہ جو بٹاوا نامی جہاز پر پیلسے ٹرٹ کے ساتھ تھا اور جس کو بعد میں بغاوت میں حصہ لینے کے جرم میں سزائے موت ہو گئی تھی۔ شاید یہ نقل اس وقت لکھی گئی ہو کہ جب 1628 میں اس کا لکھنے والا جہاز میں جانے کے لئے ہالینڈ میں انتظار کر رہا تھا۔ کتاب کا متن اس عہد کے تجارتی طرز تحریر کا نمونہ ہے۔ اور کافی واضح اور صاف ہے۔ غیر ملکی نام اور الفاظ کو اطالوی رسم الخط میں لکھا گیا ہے' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نقل کرنے والا اس طرز تحریر کا عادی نہیں تھا' اسی لئے اس میں جابجا غلطیاں ہیں کہ جنہیں درست کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا ہندوستانی ناموں سے روشناس نہیں تھا۔ لیکن غیر ملکی ناموں کی اس وقت سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب پڑھنے والا پیلسے ٹرٹ کی املاء سے واقف ہو جاتا ہے کہ وہ ان ناموں کو کس طرح سے لکھتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس نے ہندوستانی ناموں کو بالکل صحیح لکھا ہو گا۔ کیونکہ بروکے نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ آگرہ کی زبان جانتا ہے۔ اس لئے اگر کتاب میں ناموں کی غلطیاں ہیں تو اس کی ذمہ داری نقل کرنے والے پر ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ موجودہ نسخہ تصحیح شدہ ہو۔ بمقابلہ اس کے جو تھیونو نے استعمال کیا تھا۔ اس کے ترجمہ میں جو تاریخ لکھی ہے وہ یہ ہے "آگرہ' 15 فروری

1627ء-" اگر یہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو مسودہ اس نے استعمال کیا تھا۔ اسے اسی موسم بہار میں آگرہ سے ہالینڈ بھیجا گیا تھا۔ اس کے بعد پیلسیے ترٹ ہندوستان میں ایک سال اور رکا۔ اگر موجودہ مسودہ کو 1628ء میں ہالینڈ میں نقل کیا گیا تو اس کا مطلب ہے کہ اس میں جو اضافے اور تصحیحات کی گئیں وہ تھیونو کو دستیاب نہیں ہوئیں تھیں۔ میرے اس قیاس کو اس سے تقویت ملتی ہے کہ تھیونو کے ترجمہ اور موجودہ مسودے میں جو فرق ہے' وہ دو علیحدہ مسودوں کی موجودگی کو ظاہر کرتا ہے لیکن میرے قیاس کی بنیاد اس تاریخ پر ہے کہ جو تھیونو نے دی ہے۔ مگر اس میں مشکل ہے کہ وہ سند اور تاریخ کے معاملہ میں احتیاط نہیں کرتا ہے۔

اس ترجمہ کا مقصد یہ ہے کہ پیلسیے ترٹ کے بیانات اور اظہار کو جس قدر ممکن ہو اسی کی زبان میں بیان کیا جائے۔ لیکن اس شکل میں کہ جو موجودہ دور کے قارئین کے سمجھنے کے لئے ضروری ہو۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کروں کہ اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ میرے لئے ممکن نہیں تھا' کیونکہ اس کا متن اور عبارت کی ساخت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ پیلسیے ترٹ کے پاس الفاظ کا تو بڑا ذخیرہ تھا۔ مگر اسے ان الفاظ کو استعمال کرنے کا گر نہیں آتا تھا۔ وہ جس طریقہ سے کسی چیز کو بیان کرتا ہے تو اس کی عبارت میں لمبے لمبے جملے آ جاتے ہیں' اور کہیں کہیں تو جملے اس قدر الجھ جاتے ہیں کہ ان سے معنی نکالنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ میں نے فٹ نوٹس میں ان جگہوں کی نشان دہی کر دی ہے کہ جہاں میں نے متن کو قیاس لگا کر پڑھا ہے اور اس سے مطلب نکالا ہے کہیں کہیں وضاحت کی غرض سے اختصار سے بھی کام لینا پڑا ہے۔

اس ترجمہ میں جو زبان استعمال کی گئی۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ان ہندوستانی الفاظ کو کہ جو انگریزی میں شامل ہو گئے ہیں' انہیں اسی طرح سے رہنے دیا گیا ہے جہاں ضرورت پڑی تو ان کے بارے میں تشریح کر دی گئی ہے۔ لیکن جو الفاظ کے اب متروک ہو گئے ہیں۔ ان کے لئے جدید اصطلاحات یا الفاظ کو استعمال کیا گیا

ہے مثلاً "مورز" کے بجائے "مسلمان" اور "کافروں" کے بجائے "ہندو" کے الفاظ۔ وہ الفاظ کے جن کا ابتداء میں مطلب لینن (Linen) سے تھا۔ ان کی جگہ روئی کی اشیاء کالیکو کو استعمال کیا ہے۔ فیکٹر کے لئے ڈچ زبان میں "کوآپ مین" (Coopman) آیا ہے کہ کومپٹوئر (Comptair) کے لئے فیکٹری یا تجارتی کوٹھی ترجمہ کیا ہے۔ ہندوستانی ناموں کو جیسا کہ اب بولا جاتا ہے' اس طرح سے لکھا ہے۔ فٹ نوٹس اس لئے دیئے گئے ہیں تاکہ متن کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھا جا سکے۔ میں نے اس قسم کی کوشش نہیں کی کہ کتاب میں ہم عصر تاریخوں سے زیادہ سے حوالہ دے کر کتاب کو بھاری کروں۔

اپنی یادداشتوں میں مختصر طور پر پیلسیے ٹرٹ نے مغلوں کی اس تاریخ کا حوالہ دیا ہے کہ جو شاید اس نے لکھی تھی' یا لکھنے کا ارادہ تھا۔ شاید اس کو ڈی لائٹ کی مغلوں کی تاریخ میں شامل کر دیا گیا ہو۔ اس کتاب کے بارے میں ونسنٹ اسمتھ کی یہ رائے ہے کہ اکبر کے دور حکومت پر تحقیق کے لئے ابتدائی ماخذوں میں سے یہ ایک ماخذ ہے۔ جس کو تنقیدی نقطہ نظر سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے(6) ڈی لائٹ نے لکھا ہے کہ مغلوں کے بارے میں بکھری ہوئی یہ معلومات اسے بروکے کے ذریعہ ملیں تھیں 1624ء میں بروکے نے مغلوں کے بارے میں ہمایوں کے عہد تک کے واقعات لکھ کر بھیجے تھے کہ جو اس نے احتیاط کے ساتھ جمع کئے تھے(7) اگر مغلوں کے بارے میں یہ وقائع 1627ء میں ہالینڈ بھیجے گئے' تو اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بروکے نے واقعات کو جمع کرنے کے لئے آگرہ میں پیلسیے ٹرٹ سے رجوع کیا ہو گا کہ جو اس وقت وہاں مقیم تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ پیلسیے ٹرٹ نے جو کچھ لکھا ہو اسے بروکے نے اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہو۔ اسی لئے اس کا کوئی مسودہ نہیں ملتا ہے۔ اسی طرح ہمیں اس کا بھی کوئی حق نہیں کہ ہم پیلسیے ٹرٹ کے اس دعوی کو رد کریں کہ اس نے ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا اور اس پر کتاب لکھی تھی(8)

آخر میں اس کے نام کے تلفظ کے بارے میں بھی وضاحت کر دوں۔ تھیونو نے اس کے نام کو فرانسیسی طرز میں فرانسو لکھا ہے جو کہ انگریزی میں فرانس ہو جاتا ہے۔ اس کے خاندان کے نام کا تلفظ سرکاری دستاویزات میں پیلسے رُٹ ہے' لیکن اس کے دستخط میں یہ پیل سارٹ ہے۔ بروکے اسے پیل سر لکھتا ہے۔ لیکن اس کا نام فرانسکو پیلسے رُٹ' اس کے اپنے عہد کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ

مئی 1925ء

حوالہ جات

1- Henry Kingsley : Tales of Old Travel. London. 1869.

2- ڈچ ایسٹ کمپنی کے بارے میں مزید تفصیل کے لئے مورلینڈ کی کتاب "اکبر سے اورنگ زیب" (شائع شدہ لندن 1923ء) دیکھئے۔

3- The English Factories in India, 1622-23. p.281

4- یہ رپورٹ داگ رجسٹر' 22 مارچ 1636' سے لی گئی ہے۔

5- رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل۔ جنوری 1923ء ص۔ 85

6- اسمتھ: اکبر دی گریٹ مغل (آکسفورڈ 1919ء)

7- ڈائریکٹر کو لکھا ہوا خط مورخہ 16 دسمبر(1627ء)

8- اس کے دو مسودے ڈچ آر کائیوز میں موجود ہیں' مگر ان پر مصنف کا نام نہیں ہے۔

رپورٹ

یہ رپورٹ میرے ان تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے کہ جو میں نے یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سینئر فیکٹر کی حیثیت سے، پیٹر فان۔ ڈین۔ بروکے کی ماتحتی میں آگرہ کی تجارتی کوٹھی میں سات سالہ قیام کے دوران لکھی۔ اس دوران میں مجھے تجارت کی غرض سے دوسرے شہروں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ذیل میں اس رپورٹ کی تفصیل ہے:

آگرہ کا شہر

سب سے پہلے آگرہ شہر کا ذکر کروں کہ جو 28 اور "45 عرض البلد پر واقع ہے۔ یہ شہر کافی وسیع و عریض، کھلا ہوا، اور بغیر فصیلوں کے ہے۔ مگر اس پر زوال کے آثار نظر آتے ہیں۔ شہر کے مکانات اور سڑکیں بغیر کسی منصوبہ اور پلان کے بنی ہوئی ہیں۔ اگرچہ یہاں پر شہزادوں اور امراء کی حویلیاں موجود ہیں، مگر وہ سب تنگ و تاریک گلیوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ اس شہر کی اچانک اور غیر معمولی ترقی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے یہ بیانہ کی حدود میں واقع ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ لیکن جب 1566ء میں اکبر نے اس شہر کو اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا اور دریائے جمنا کے کنارے ایک عالیشان قلعہ تعمیر کرایا۔ تو اس قصبہ کی شکل و صورت ہی بدل گئی۔ اس کے اردگرد گھنے جنگلات کی وجہ سے اب یہ شہر ایک شاہی باغ معلوم ہوتا ہے۔ شاہی محلات اور قلعہ کی وجہ سے امراء نے بھی شہر میں کہ جہاں انہیں جگہ ملی، وہاں اپنی حویلیاں تعمیر کرائیں۔ اس غیر منصوبہ بندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں پر کوئی منڈیاں یا

بازار اس طرح سے نہیں ہیں جیسے کہ لاہور' برہانپور' احمد آباد یا دوسرے شہروں میں ہیں۔ شہر میں مکانات ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ ہندو مسلمان اور امیر و غریب سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ اگر موجودہ بادشاہ (جہاں گیر) اس شہر کو اپنی رہائش گاہ بنا لیتا جیسا کہ اکبر نے بنایا تھا' تو یہ شہر دنیا کے مشہور شہروں میں سے ایک ہو جاتا۔ اس شہر کے دروازے جو اکبر نے دفاع اور حفاظت کے لئے تعمیر کرائے تھے (مداری دروازہ' چہار سو دروازہ نیم دروازہ' پیٹو (؟) دروازہ' نوری دروازہ) وہ اب شہر کے درمیان میں آ گئے ہیں' اور اس کے آگے جو شہر پھیلا ہے وہ موجودہ شہر سے تین گناہ زیادہ ہے۔

شہر کی چوڑائی' اس کی لمبائی کے مقابلہ میں زیادہ نہیں ہے کیونکہ ہر ایک کی یہ کوشش ہے کہ وہ دریا کے قریب رہے۔ اس لئے دریا کے کناروں پر امراء کے شاندار محلات ہیں جس کی وجہ سے یہ خوبصورت اور دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ اب میں ان محلات کے بارے میں ترتیب سے لکھتا ہوں :

جب ہم شمال کی جانب دیکھیں تو یہاں پر بہادر خاں' اسیر گڑھ کے سابق حکمراں کا محل ہے۔ (اسیر گڑھ برہانپور سے 5 کوس کے فاصلہ پر ہے) اس کے بعد دوسرا محل راجہ بھوج کا ہے (؟) جو کہ برہانپور کے گورنر (پنج ہزاری منصب) رائے رتن کا باپ ہے (؟) اس کے بعد ابراہیم خان (سہ ہزاروں) رستم قندہاری (پنج ہزاری) راجہ کشن داس (سہ ہزاری) اقتدار خاں' آصف خاں نور جہاں کا چھوٹا بھائی (پنج ہزاری) شہزادی خانم' موجودہ بادشاہ کی بہن' جس کی شادی گجرات کے سابق حکمراں مظفر خاں سے ہوئی ہے۔ گلزار بیگم' موجودہ بادشاہ کی بیگم۔ خواجہ محمد (؟) (دو ہزاری) خواجہ بنسی' جو کہ شہزادہ خرم کا داروغہ جائداد تھا (ایک ہزاری) وزیر خاں (پنج ہزاری)۔ اس کے بعد سکھ پورہ آتا ہے۔ یہ ایک احاطہ ہے کہ جس میں اکبر بادشاہ کی بیوائیں رہتی ہیں۔ اس کے بعد آگرہ شہر کے گورنر اعتبار خاں' خواجہ سرا کے محلات ہیں۔ ان کے بعد باقر خاں (سہ ہزاری) مرزا عبدالصغیر (ایک ہزار پانچ سو) اعتماد الدولہ (پنج ہزاری) خواجہ

ابوالحسن (پنج ہزاری) رقیہ سلطان بیگم' موجودہ بادشاہ کی بہن کہ جس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ ان کے محلات ہیں۔

ان محلات کے بعد شاہ برج یا شاہی قلعہ ہے۔ اس کی فصیلیں سرخ پتھروں سے تعمیر کی گئی ہیں۔ فیصلوں کی چوڑائی 3/4 گز ہے' پھیلاؤ میں یہ 2 کوس ہے۔ اس کی تعمیر میں جو بھی خرچہ ہوا' اور اس کا جو طرز تعمیر ہے۔ اس وجہ سے یہ دنیا کی مشہور عمارتوں میں سے ایک ہے۔ یہ عمارت مناسب جگہ پر واقع ہے اس کے اردگرد کا ماحول انتہائی خوشگوار ہے۔ اس کا جو حصہ دریا کے رخ پر ہے وہاں پتھروں کی خوبصورت جالیاں اور سنہری کھڑکیاں ہیں -یہاں سے بادشاہ اکثر ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا ہے۔ اس کے تھوڑے فاصلہ پر غسل خانہ ہے جو کہ سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ شکل میں یہ چوکور ہے۔ اس کے گنبد پر باہر سے طلاء کاری ہے جس کی وجہ سے یہ قریب سے دیکھنے پر شاہی اور دور سے دیکھنے پر شہنشاہی نظر آتا ہے۔ اس کے آگے موجودہ ملکہ نورجہاں کا محل ہے۔ قلعہ میں شہزادوں' بیگمات' اور حرم کی خواتین کی رہائش گاہیں ہیں۔ انہیں میں ایک محل مریم زمانی کا ہے جو کہ اکبر کی بیگم اور موجودہ بادشاہ کی ماں ہے۔ ان کے علاوہ تین اور محلات ہیں کہ جو اتوار' منگل' اور سنیچر کہلاتے ہیں بادشاہ انہیں دنوں میں یہاں ہوتا ہے۔ بنگالی محل میں مختلف اقوام کی عورتیں رہتی ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ قلعہ ایک چھوٹا سا شہر ہے کہ جس میں مکانات ہیں' سڑکیں ہیں' دوکانیں ہیں' اندر سے یہ قلعہ معلوم نہیں ہوتا' مگر باہر سے دیکھو تو یہ ایک ناقابل تسخیر قلعہ نظر آتا ہے۔

قلعہ سے گذر کر نخاس یا منڈی کا علاقہ آتا ہے۔ یہاں پر صبح کے وقت گھوڑے' اونٹ' بیل و گائے' خیمے' کپڑے اور دوسری کئی قسم کی چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ اس سے آگے چند بڑے امراء کے محلات ہیں جن میں خصوصیت سے خان اعظم کے لڑکے مرزا عبداللہ (سہ ہزاری) آغا نور' شاہی فوج کا عہدہ دار (سہ ہزاری) جہاں خاں (دو ہزاری) خان اعظم کا لڑکا مرزا خرم (دو ہزاری) مہابت خاں (شش ہزاری) خان عالم

(پنج ہزاری) راجہ پپٹ (؟) سنگھ (سہ ہزاری) آنجہانی مان سنگھ (پنج ہزاری) اور راجہ مادھو سنگھ (دو ہزاری) کی حویلیاں ہیں۔

دریا کے دوسری جانب سکندرہ نامی شہر ہے۔ یہ آباد شہر ہے اور خوبصورتی و منصوبہ بندی کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ یہاں کی اکثر آبادی تاجروں کی ہے۔ اسی شہر سے مشرقی علاقوں اور بھوٹان سے تجارتی سامان آتا ہے۔ خاص طور سے بنگال سے کپڑا' پٹنہ سے خام سلک' اور دوسرے علاقوں سے مصالحہ جات و جڑی بوٹیاں وافر مقدار میں آتی ہیں کہ جن کی تفصیل یہاں دینا ناممکن ہے۔ یہاں پر نورجہاں بیگم کے مذکورہ عہدے دار ان اشیاء پر دریا پار کرنے سے قبل کسٹم ڈیوٹی وصول کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کی منڈی میں اجناس کی کئی قسمیں' مکھن' گھی' اور دوسری چیزیں مشرقی علاقوں سے آتی ہیں۔ اور پھر ملک کے دوسرے حصوں میں یہاں سے جاتی ہیں۔ اس تجارت کے بغیر ملک میں غذائی اشیاء کی فراہمی ناممکن ہے۔ اگر اس میں رکاوٹ یا کمی آجائے تو لوگ فاقہ و قحط سے مرجائیں۔ اس لئے یہ جگہ تجارت کی سب سے بڑی منڈی ہے یہ شہر دو کوس کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے' اگرچہ چوڑائی میں کم ہے۔ مگر یہاں پر خوبصورت باغات اور بلند و بالا عمارتیں ہیں' ان میں سے مشہور سلطان پرویز' نورجہاں' اور اس کے مرحوم باپ اعتمادالدولہ کی عمارتیں ہیں۔ اس کا مقبرہ بھی اس شہر میں ہے۔ اس کی تعمیر پر اس کا تین لاکھ پچاس ہزار روپیہ کا خرچہ آچکا ہے اور یہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے' اندازہ ہے کہ اس کے ختم ہونے تک اس پر دس لاکھ مزید اور خرچ ہوں گے۔ یہاں پر دو مشہور باغات ہیں کہ جو بادشاہ کی ملکیت ہیں' یہ چہار باغ اور موتی محل کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے باغات ہیں کہ جو اونچی دیواروں سے گھرے ہوئے ہیں۔ اور جن کے دروازے باغ سے زیادہ قلعہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان باغات و محلات کی وجہ سے شہر کی خوبصورتی بڑھ گئی ہے۔ یہاں کے امراء کی دولت اور شان و شوکت ہمارے ہاں کے امراء سے زیادہ ہے۔ جب تک وہ زندہ رہتے ہیں' اپنے باغات سے لطف اٹھاتے ہیں' جب یہ مرجاتے

ہیں تو یہی باغات ان کے مقبرے بن جاتے ہیں۔ اس شہر میں ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ میں ان کا ذکر کرنا نہیں چاہتا اور دوبارہ سے اس ملک کی تجارت کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔

آگرہ کے مشرقی علاقوں کی تجارت

اکبر کے دور حکومت میں تجارت کو بڑا فروغ تھا' یہ صورت حال موجودہ بادشاہ کے ابتدائی عہد میں بھی رہی' کیونکہ اس وقت تک اس میں تازگی و توانائی اور حکومت کرنے کا سلیقہ تھا۔ لیکن جب سے اس نے خود کو لہو و لعب میں مبتلا کر لیا ہے' اس وقت سے عدل و انصاف کی جگہ ظلم و ستم و تشدد نے لے لی ہے۔ اگرچہ ہر گورنر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے عوام کی حفاظت کرے' لیکن اس کے برعکس ہو یہ رہا ہے کہ ہر گورنر مختلف حیلوں' بہانوں سے لوگوں کو لوٹ رہا ہے اور ان کی ذرائع آمدن پر قابض ہو رہا ہے۔ کیونکہ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں کہ ان غریب لوگوں کی پہنچ نہ تو دربار تک ہے اور نہ ہی یہ بادشاہ تک اپنی شکایات پہنچا سکتے ہیں۔ نتیجہ ان سب باتوں کا یہ ہوا ہے کہ ملک تباہ ہو گیا ہے' لوگ غریب سے غریب تر ہو رہے ہیں۔ اس شہر کے پرانے لوگوں کا کہنا ہے کہ اب اس میں ماضی کی کوئی شان و شوکت باقی نہیں رہی ہے کہ جس کی وجہ سے کبھی یہ دنیا بھر میں مشہور تھا۔ اس شہر کی تجارتی اہمیت اس لئے ابھی تک باقی ہے کیونکہ جغرافیائی طور پر یہ ایک ایسی جگہ واقع ہے کہ جہاں سے تمام ملکوں کو راستے جاتے ہیں۔ اس لئے اس راستہ سے تمام تجارتی اشیاء کو گذرنا ہوتا ہے' مثلاً گجرات' ٹھٹھ' کابل قندھار' ملتان اور دکن برہانپور اور لاہور کے راستے یہیں سے گذرتے ہیں بلکہ بنگال اور تمام مشرقی علاقے بھی یہاں سے ملے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نعم البدل کے طور پر نہیں ہے۔ ان راستوں پر بڑی تعداد میں تجارتی اشیاء آتی جاتی ہیں' خصوصیت سے کپڑے اور روئی کی بنی ہوئی اشیاء۔

مشرقی علاقہ جگن ناتھ تک پھیلا ہوا ہے' اس میں جو مشہور ہیں ان کے بارے میں مختصراً ذکر کرنا پسند کروں گا۔

الہ آباد:-

(150 کوس) یہاں کوئی خاص پیداوار نہیں ہے' اس لئے تجارت بھی بہت کم ہے۔ مگر یہ شہر خوبصورت اور تفریح کے لئے مناسب ہے۔ یہاں پر اکبر بادشاہ نے ایک عمدہ قلعہ بنوا دیا تھا۔ یہیں پر تین دریا آکر ملتے ہیں' گنگا و جمنا اور (تیسرے دریا کا نام مسودے میں نہیں ہے' لیکن اس سے مراد سرسوتی دریا ہے جو کہ حقیقت میں نہیں' بلکہ اساطیر میں یہاں آکر گنگا سے ملتا ہے)

جونپور:-

(مزید 25 کوس) یہاں پر کپڑے کی کئی قسمیں تیار ہوتی ہیں' جن میں پگڑیاں' پٹکے' اور چھینٹوں کی کئی اقسام ہیں۔ ان کے علاوہ کھردرے قسم کے سستے قالین بھی تیار ہوتے ہیں۔

بنارس:-

(مزید 5 کوس) یہاں بھی پٹکے' پگڑیاں' اور عورتوں کے ملبوسات بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ تانبے کے برتن تیار ہوتے ہیں کہ جو ہندو اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں۔

اودھ:-

(مزید 3 کوس) یہاں 16 گز کے ٹکڑوں میں سستے قسم کا کپڑا دستیاب ہوتا ہے۔

لکھاور:-

(مزید 15 کوس) یہاں پر عمدہ قسم کا سفید کپڑا جو "عنبرتی" کہلاتا ہے' جو لمبائی میں

14 گز' اور چوڑائی میں مختلف سائز کا ہوتا ہے' وہ بنایا جاتا ہے۔ ایک تھان کی قیمت دس روپیہ ہے۔

پٹنہ :-

(آگرہ سے 300 کوس) یہاں پر سالانہ ایک ہزار سے دو ہزار من سلک تیار ہوتی ہے۔ اس کی سب سے اچھی قسم 16 سے 17 مہر میں ایک من آتی ہے۔ ایک مہر کی قیمت 7 روپیہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ 110 اور 120 روپیہ فی من کے ہوئے۔ اس پیداوار کا تمام حصہ گجرات میں فروخت ہو جاتا ہے۔ اگر اس میں سے تھوڑا بہت بچ جاتا ہے تو وہ آگرہ میں آتا ہے۔ اس سے قبل پٹنہ میں انگریزوں کی ایک تجارتی کوٹھی تھی کہ جہاں سے وہ خام سلک خریدتے تھے' چھ یا سات سال کا عرصہ ہوا کہ نقصانات کی وجہ سے کوٹھی کو بند کر دیا گیا ہے' اور مستقبل قریب میں ان کا دوبارہ سے یہاں تجارتی تعلقات قائم کرنا نظر نہیں آتا ہے۔ اب وہ ایرانی سلک سستے داموں میں خرید رہے ہیں۔ پٹنہ میں ململ بھی بنتی ہے' مگر اس کی کوالٹی اچھی نہیں ہے' اور ایک تھان کی قیمت چار سے پانچ روپیہ ہے۔ اس کے علاوہ ڈھالیں بھی تیار ہوتی ہیں کہ جو آگرہ میں ملتی ہیں۔

چمپور :-

(شاید : شاھبازپور) اور سنار گاؤں : ان کے قریب جس قدر گاؤں ہیں وہ جولاہوں سے بھرے پڑے ہیں جو کہ انتہائی اعلیٰ قسم کا کپڑا تیار کرتے ہیں۔ خاص طور سے ململ' جو کہ دوسری جگہوں کے مقابلہ میں زیادہ لمبی اور چوڑی ہوتی ہے۔

جگن ناتھ :

(یہاں سے 600 کوس) یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں مشرقی علاقہ ختم ہوتا ہے اور بنگالی شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی اعلیٰ قسم کی ململ اور عمدہ قسم کی چھینٹیں جو حمام اور

سین کہلاتی ہیں' وہ بنتی ہیں۔ یہ بستر کی چادروں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ لیکن مہنگی ہونے کی وجہ سے یہ آگرہ کی منڈیوں میں کم آتی ہیں۔ اس سے اور آگے چلیں تو ڈھاکہ' ست گام (ست گاؤں' چٹگام) اور بیبیل کی بندرگاہ ہے' جو مغل بادشاہ کی سلطنت میں شامل ہیں۔ ان شہروں میں پرتگالیوں کی آبادیاں ہیں' یہاں ایک زمانہ میں تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔ لیکن اب یہ شہر مغلوں کے قبضہ میں آچکے ہیں۔ موجودہ بادشاہ نے پرتگالیوں پر نگرانی کے لئے اس علاقہ میں ہر جگہ قلعے بنوا دئے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ان کے تجارتی جہاز مکاؤ سے ہر سال آیا کرتے تھے اور کپڑا و مصالہ جات اور دوسری ضرورت کی اشیاء یہاں لاتے تھے۔ ان چیزوں کو فروخت کر کے' ان کے بدلے میں سفید کاٹن کے کپڑے' بنگالی ململ' کے علاوہ گھی' چاول' اور اسی قسم کی دوسری اشیاء جہازوں میں بھر کر لے جاتے تھے۔

یہ تمام علاقے بے انتہا زرخیز ہیں اور یہاں بڑی مقدار میں اناج' خاص طور سے گیہوں' چاول پیدا ہوتے ہیں اس کے علاوہ شکر' اور گھی کی پیداوار ہے' یہ یا تو دریائے جمنا کے راستے یا بیل گاڑیوں میں خشکی کے راستے آگرہ آتا ہے اور ان سے بادشاہ اور اس کی فوج کی غذائی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ یہاں سانبھر کا نمک' افیم' چھینٹ' گھوڑے' اور کپڑے کی کئی قسمیں جو کہ سورت اور برہانپور کے درمیان میں تیار ہوتی ہیں' برائے فروخت لائی جاتی ہیں۔

آگرہ اور فتح پور سیکری سے 12 کوس کے فاصلے پر اچھی قسم کے قالین بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کی مقامی پیداوار کوئی خاص نہیں ہے اگرچہ یہاں پر ہر چیز باہر سے لائی جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود شہر میں ہر قسم کے دست کار اور ہنرمند موجود ہیں جو ہر چیز کی اچھی نقل تیار کر لیتے ہیں مگر خود سے اس قابل نہیں کہ کوئی اپنا ڈیزائن تیار کر سکیں۔ اب اس کے بعد ہم نیل کی کاشت کے بارے میں بیان کریں گے کہ جو کوئل' میوات اور آگرہ و بیانہ کے گاؤں میں ہوتی ہے۔ یہ دنیا بھر میں تجارت کی اہم شے ہے کہ جس کی مانگ ہر طرف ہے۔ (نیل کی کاشت کے بارے میں پیلسے رٹ

کی تفصیل قارئین کی دلچسپی کے لائق نہیں۔ اس کا تعلق ڈچ کمپنی کو اس کی کاشت' قیمت' اور اس کی مختلف اقسام کے بارے میں اطلاع دینا تھا' آگے چل کر اس نے گجرات کی تجارت کے بارے میں لکھا ہے کہ جو خالص تجارتی نقطہ نظر سے ہے اور اس میں عام قارئین کی دلچسپی کی کوئی خاص چیز نہیں ہے' اس کے بعد اس نے ڈچ کمپنی کو مشورے دئے ہیں کہ ہندوستان میں کن کن اشیاء کی تجارت کرنی چاہئے اور اس کے لئے کون سے طریقوں کو اختیار کرنا چاہئے)

آگرہ کے مشرق اور مغرب میں واقع صوبوں کا ذکر

لاہور، آگرہ سے 300 کوس مشرق، مغرب میں واقع ہے۔ انگریزوں کے آگرہ آنے سے پہلے یہ ہندوستان کا مشہور تجارتی مرکز تھا اور یہاں پر آرمینا اور شام کے تاجر منافع بخش تجارت کرتے تھے۔ اس وقت نیل کی اہم منڈی آگرہ نہیں بلکہ لاہور تھا، کیونکہ یہ ان تاجروں کے لئے سہولت کا باعث تھا کہ جو مقررہ موسموں میں قندہار سے اصفہان اور شام قافلوں کی شکل میں جاتے تھے۔ اس لئے نیل شام کے راستے سے یورپ جاتی تھی، یہ یورپ میں لاؤری یا لاہوری کہلاتی تھی، اب بھی یہاں سے گولکنڈا، منگاپٹنم، اور مالی پٹم کے بنے ہوئے کپڑوں کی تجارت ہوتی ہے، مگر بہرحال تجارت کی پہلی والی صورت اب باقی نہیں رہی ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اب یہ تجارت مرچکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں سے درآمد کرنے والی اشیاء اب صرف ترکی اور ایران کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں کہ جس کی مانگ محدود ہے۔ چونکہ اب تجارت خشکی سے زیادہ سمندری راستوں سے ہوتی ہے، اس لئے اس کی اہمیت گھٹ کر رہ گئی ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر لاہور کی تجارت عملی طور پر ختم ہو گئی ہے، ہندو یا کھتری تاجر جو یہ تجارت کرتے تھے ان کی شہرت اب تک باقی ہے، مگر ان کا گذارہ پرانے کمائے ہوئے منافع پر ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ سے موجودہ بادشاہ سال کے پانچ یا چھ مہینے لاہور میں گذارتا ہے (بقیہ وقت، خصوصیت سے گرمیوں کا زمانہ یہ کشمیر یا کابل میں رہ کر گذارتا ہے) اس کی رہائش کی وجہ سے شہر کی حالت تھوڑی بہت بہتر ہو گئی ہے۔ لیکن اس کی یہ ساری شان و شوکت، شاہی عمارتوں، محلات، باغات اور شاہی اخراجات کی وجہ سے ہے، اس لئے اس کے اثرات بھی محدود ہیں۔

شہر کے ساتھ ہی دریائے راوی بہتا ہے' یہ کشمیر کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور ملتان سے ہوتا ہوا ٹھٹھہ و بھکر کو جاتا ہے۔ اس میں چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ تجارتی سامان لیجایا جاتا ہے۔ لاہور سے آگرہ خاص طور سے قالین آتے ہیں جو کہ وہاں تیار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کابل سے پھل اور قندہار و ملتان سے دوسرا سامان آتا ہے۔ آگرہ سے لاہور وہ مصالحہ جات جاتے ہیں کہ جو ہم یہاں پر لاتے ہیں۔ (ان کی مقامی کھپت اس وقت کم ہو جاتی ہے کہ جب یہاں بادشاہ کا قیام نہیں ہوتا ہے' یا جب کوئی فوجی کیمپ نہیں ہوتا ہے) اس کے علاوہ ہر قسم کی سفید کاٹن کے کپڑے' جن میں بنگالی اور گولکنڈہ کے بنے ہوئے شامل ہوتے ہیں۔ احمد آباد کی بنی ہوئی پگڑیاں پٹکے' اور سلک کے کپڑے' پٹنہ کی سلک' ان چیزوں کے ساتھ ساتھ لاکھ' کالی مرچیں' اور دوسری بہت سی اشیاء کہ جن کے نام لینا مشکل ہے۔ ان کی یہاں کھپت ہے۔

ملتان:

ملتان' صوبہ کا مرکزی شہر ہے اور لاہور سے 140 کوس کے فاصلہ پر ہے یہ صوبہ پیداوار کے لحاظ سے انتہائی زرخیز ہے اور یہاں سے تجارتی قافلے قندہار ہوتے ہوئے ایران جاتے ہیں۔ ایران کے ساتھ اس کی تجارت کافی پھیلی ہوئی ہے۔ ملتان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے قریب تین دریا بہتے ہیں' راوی' جہلم' اور سندھ۔ دریائے سندھ کشمیر کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور ملتان آتے آتے اس کی موجوں کے بہاؤ میں تیزی آ جاتی ہے۔ ان دریاؤں میں ہلکی کشتیاں چلتی ہیں۔ یہاں پر جو شکر تیار کی جاتی ہے اسے کشتیوں کے ذریعہ ٹھٹھہ تک لیجایا جاتا ہے۔ یہ شکر لاہور بھی فروخت کے لئے جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں افیم' سلفر' اور دوسری اشیاء بہتات سے ہیں۔ یہاں کے اونٹ پورے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ ملتان کے دست کار انتہائی خوبصورت اور عمدہ کمانیں بناتے ہیں۔ یہاں سے کپڑے اور کپڑوں کا سامان قندہار تک جاتا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں تجارت کی غرض سے آنے والا

سامان پہلے آگرہ آتا ہے' پھر یہاں سے یہ ملک بھر میں بھیجا جاتا ہے۔ آگرہ اور لاہور سے ستا قسم کا کپڑا ملتان جاتا ہے۔ اس طرح سے کپڑوں کی دوسری قسمیں بنگال' اور برہانپور سے یہاں آتی ہیں۔

ٹھٹھہ:

یہ سندھ کا مرکزی مقام ہے۔ اور سمندر سے اس کا فاصلہ 80 کوس ہے بندرگاہ کا نام لاہوری بندر ہے کہ جہاں پر تمام بڑے جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں۔ بندرگاہ سے تجارتی سامان کشتیوں کے ذریعہ یہاں لایا جاتا ہے' مگر موجوں کے بہاؤں کی وجہ سے سامان کے آنے میں 8 سے 10 دن لگ جاتے ہیں۔ اس ملک کو اکبر کے زمانہ میں اس کے ایک امیر خان خاناں نے فتح کیا تھا۔ یہ شہر آگرہ سے جنوب کی طرف 400 کوس کے فاصلہ پر براستہ جیسلیمر واقع ہے۔ لاہور سے براستہ ملتان اس کا فاصلہ 700 کوس ہے۔ یہ شہر اس وقت بڑا پر رونق اور خوش حال تھا کہ جب تک پرتگالیوں کا ہرمز کی بندرگاہ پر قبضہ رہا اور انہوں نے ٹھٹھہ کو اپنا تجارتی مرکز بنائے رکھا۔ یہاں کی سفید کاٹن کی بنی ہوئی اشیاء میرے خیال میں گجرات سے بہت اچھی ہوتی ہیں' جب کہ دونوں کی قیمت میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ کپڑے کے علاوہ ٹھٹھہ میں منقش میزیں' قلمدان' اور اسی قسم کی چیزیں مقامی طور پر بڑے تعداد میں تیار ہوتی ہیں اور ان پر ہاتھی دانت کی بڑی مہارت سے کٹائی کی جاتی ہے۔ یہ گوا اور دوسری ساحلی شہروں کو درآمد کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ تجارت اب ختم ہو گئی ہے۔ کیونکہ ہرمز سے تجارت کے خاتمہ کے بعد اصفہان سے آنے والے تاجر اب بڑی مشکلوں اور خطرات کے بعد یہاں تک پہنچ پاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ سلک لے کر آتے ہیں' مگر چھپا کر' کیونکہ ایران سے تمام برآمدات پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک خاص کی قسم کی جڑیں لے کر آتے ہیں جن سے چیزوں کو سرخ رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ خشک میوہ جات کہ جن میں خاص طور سے بادام اور کشمش ہوتی ہے' وہ بڑی مقدار میں لاتے

ہیں۔ اپنے تجارتی منافع کو بڑھانے کی غرض سے یہ سونے کے ڈلے بھی اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ ان چیزوں کے بدلے میں یہ سفید کاٹن کی بنی اشیاء' سلک' پگڑیاں' پٹکے بنگالی کپڑا' لاہوری نیل' چھینٹ' مصری' شکر جو کہ لاہور اور ملتان سے آتی ہے' وہ لے جاتے ہیں۔

کشمیر

کشمیر 35 این۔ عرض البلد پر واقع ہے۔ مشرق کی جانب اس کی سرحدیں تبت خورد و کلاں تک جاتی ہیں۔ جو کہ دس دنوں کے سفر کے فاصلہ پر ہے۔ جنوب میں اس کی سرحدیں کابل سے جا کر ملتی ہیں جو کہ یہاں سے 30 دن کا سفر ہے۔ مغرب میں پونچھ اور پشاور واقع ہیں۔ اس کا سب سے خوبصورت شہر دیرناگ ہے جہاں کہ بادشاہ کے لئے ہندوستان میں سب سے عمدہ شکارگاہیں ہیں۔ اس علاقہ میں بڑے خوبصورت اور شہر اور گاؤں واقع ہیں' ان کی اتنی تعداد ہے کہ ان سب کا بیان کرنا مشکل ہے۔ اس لئے اب ہم سب سے مشہور شہر کشمیر (سری نگر) کا بیان کرتے ہیں جو کہ اونچے اونچے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ یہاں کا ایک پہاڑ مسلمانوں میں تخت سلیمان کہلاتا ہے۔ جس کے بارے میں عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں' اور کئی کراماتیں اس سے منسوب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر کئی قدیم تحریریں موجود ہیں' اور یہ کہ خود حضرت سلیمانؑ نے یہاں اپنا تخت بنوایا تھا۔ شہر میں پھلوں والے اور دوسرے لاتعداد درخت ہیں۔ یہاں پر دو دریا بہتے ہیں۔ ان میں سے بڑا دریا دیرناگ سے آتا ہے' دوسرا چشمہ کی صورت میں ابلتا ہے۔ لیکن ان دونوں دریاؤں کا پانی نہ تو میٹھا ہے اور نہ ہی صحت مند۔ اس لئے یہاں کے باشندے اسے پینے سے قبل ابال لیتے ہیں۔ بادشاہ اور اس کے امراء کے لئے 3 یا 4 کوس سے پانی لایا جاتا ہے جو صاف اور برف کی طرح سفید ہوتا ہے۔ جہانگیر بادشاہ نے پانی کو محفوظ رکھنے کی غرض سے ایک کاریز تعمیر کرائی تھی کہ جو 10 یا 12 کوس کے فاصلہ سے قلعہ میں پانی لاتی تھی۔ لیکن اس خیال سے کہ اسے آسانی کے ساتھ دشمن یا باغی زہر آلود کر سکتے ہیں۔ اس نے کوئی 10 ہزار روپیہ

خرچ کرنے کے بعد اس منصوبہ کو ترک کر دیا۔ کشمیر میں اکثر غیر ملکی خون کے بہنے یا پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جس سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے شاید اس کی وجہ پانی ہو' پھلوں کے کھانے سے بھی یہ بیماریاں ہو سکتی ہیں۔

شہر کے مشرق میں ایک بڑا قلعہ ہے جس کی فصیلیں پتھروں سے بنی ہوئی ہیں اور جو کہ موٹائی میں 9 یا 10 فٹ ہیں۔ یہ فصیلیں پہاڑ کی چٹانوں سے مل جاتی ہیں کہ جس کی چوٹی پر ایک محل بنا ہوا ہے۔ قلعہ کے درمیان میں بادشاہ کا محل ہے' جو کہ اپنی خوبصورتی سے زیادہ اپنی کشادگی اور بلندی کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔ شمال کی جانب ملکہ کی رہائش گاہ ہے' اس کی ہمسائیگی میں اس کا بھائی آصف خاں رہتا ہے۔ اس سے ذرا اور تھوڑے فاصلہ پر مقرب خاں کا محل ہے جنوب کی جانب بادشاہ کا سب سے چھوٹا لڑکا شہریار رہتا ہے کہ جس کی شادی ملکہ کی لڑکی سے ہوئی ہے جو کہ اس کے پہلے شوہر سے ہے۔ جنوب مغرب میں ابوالحسن اور دوسرے اہم امراء کے مکانات ہیں۔ یہ تمام لوگ قلعہ کے اندر رہتے ہیں کہ جس کا رقبہ اندازاً ایک کوس کے قریب ہو گا۔ شہر بذات خود کافی پھیلا ہوا ہے جس میں کافی تعداد میں مساجد واقع ہیں مکانات صنوبر کے درختوں کی لکڑی سے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں جہاں شگاف یا دراڑیں ہیں' انہیں مٹی سے بھر دیا گیا ہے۔ دیکھنے میں یہ مکانات بڑے شاندار نظر آتے ہیں۔ رہائش کے اعتبار سے یہ شرفاء کے لئے ہیں نہ کہ گنواروں اور کسانوں کے لئے۔ ہوا اور روشنی کے لئے انہیں جگہ جگہ سے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کی چھتیں بالکل ہموار ہیں اور ان کو مٹی سے پوتا گیا ہے۔ چھتوں میں اکثر سبزی اگائی جاتی ہے یا بارشوں میں انہیں گھاس سے ڈھک دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے دور سے یہ چھتیں سبزے اور ہریالی کا بڑا خوبصورت و دلکش منظر پیش کرتی ہیں۔

اس ملک اور شہر کے لوگوں کی اکثریت غریب ہے۔ لیکن جسمانی طور پر یہ لوگ طاقتور ہیں' اور بمقابلہ ہندوستانیوں کے زیادہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ اس لئے حیرت کی بات ہے' کیونکہ یہاں مردوں اور عورتوں کو بہت کم کھانے کو ملتا ہے۔ ان کے بچے

گورے اور خوبصورت ہوتے ہیں' لیکن جب یہ بڑے ہوتے ہیں تو پیلے اور بدصورت ہوتے چلے جاتے ہیں' ان کے طور طریق' خوراک اور رہائش کو دیکھا جائے تو وہ انسانوں سے زیادہ جانوروں سے نسبت رکھتی ہے۔ عورتیں قد میں چھوٹی' گندی اور خوبصورتی سے دور ہوتی ہیں' یہ ایک کھردرے قسم کا اونی لباس پہنے رہتی ہیں۔ جو کہ گردن سے ناف تک کھلا رہتا ہے۔ اپنے ماتھے پر یہ ایک سرخ کپڑا باندھے رہتی ہیں۔ سر پر ایک گندہ اور پیلا کپڑا اوڑھے ہوئے جو بازوؤں اور ٹانگوں کو ڈھکے ہوئے ہوتا ہے۔ کاٹن کے کپڑے یہاں پر بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ اپنی غربت کی وجہ سے یہ لوگ اس قابل نہیں ہوتے ہیں کہ بار بار کپڑے اور لباس کو بدلیں۔

یہ لوگ مذہبی امور میں بڑے سخت ہیں۔ اکبر کے زمانہ میں کشمیر کو اس کے جنرل راجہ بھگوان داس نے حیلے و بہانے سے فتح کیا تھا' کیونکہ دوسری صورت میں پہاڑوں اور دشوار گذار راستوں کی وجہ سے اس ملک کو فتح کرنا آسان نہ تھا۔

کشمیر میں پھلوں کی کئی اقسام پائی جاتی ہیں' جیسے سیب' ناشپاتی اور اخروٹ وغیرہ لیکن ذائقہ میں یہ ایران و کابل کے پھلوں کے مقابلہ میں کم تر ہیں۔ دسمبر' جنوری' اور فروری میں یہاں سخت سردی ہوتی ہے' ان مہینوں میں بارش اور برف باری ہوتی ہے اور پہاڑ برف کی وجہ سے سفید نظر آتے ہیں۔ جب گرمی میں سورج چمکتا ہے تو اس وقت برف پگھلنے سے دریاؤں میں سیلاب آ جاتا ہے۔

بادشاہ کشمیر کو اس لئے پسند کرتا ہے کہ جب ہندوستان میں گرمیوں کا موسم آتا ہے تو اس کا جسم کثرت سے شراب پینے اور افیم کھانے کی وجہ سے جلنے لگتا ہے' اس لئے وہ مارچ یا اپریل میں لاہور سے کشمیر کے لئے روانہ ہو جاتا ہے۔ مئی کے مہینہ میں یہاں پہنچ جاتا ہے۔ یہ سفر انتہائی دشوار اور خطرناک ہے۔ پہاڑی راستوں کی وجہ سے جانوروں کے لئے سامان اٹھا کر چلنا مشکل ہوتا ہے' اس لئے بادشاہ اور امراء کے استعمال کا تمام سامان مزدور اپنے سروں پر اٹھا کر لاتے ہیں۔ بادشاہ کے کیمپ کے تمام لوگ اس سفر کو اپنے لئے عذاب الہٰی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس میں امیر لوگ غریب ہو

جاتے ہیں اور غریبوں کو کھانے کے لالے پڑ جاتے ہیں' کیونکہ یہاں پر ہر چیز انتہائی مہنگی ہے۔ مگر بادشاہ ان سب باتوں سے بے پرواہ ہو کر اپنی آسائش و آرام کو دیکھتا ہے اور عوام کی تکلیف کا اسے خیال تک نہیں آتا۔

کشمیر میں سوائے زعفران کے اور کوئی ایسی پیداوار نہیں کہ جو آگرہ برآمد کی جا سکے۔ زعفران کی بھی دو قسمیں ہیں: وہ جو کہ شہر کے گرد و نواح میں پیدا ہوتی ہے وہ آگرہ میں 20 سے 24 روپیہ سیر کے حساب سے فروخت ہوتی ہے۔ دوسری قسم جو شہر سے 10 میل کے فاصلہ پر کستوری میں اگتی ہے' وہ سب سے عمدہ ہوتی ہے' اور یہ 28 سے 32 روپیہ سیر تک میں فروخت ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھیڑوں کی اون سے عمدہ قسم کا کپڑا بنایا جاتا ہے۔ آگرہ میں یہ سردیوں کے موسم میں استعمال ہوتا ہے۔ دیکھنے میں یہ بڑا خوشنما ہوتا ہے۔ چونکہ اخروٹ بھی کافی تعداد میں ہوتے ہیں' اس لئے یہ بھی آگرہ برآمد کئے جاتے ہیں۔

آگرے سے جو اشیاء کشمیر بھیجی جاتی ہیں۔ وہ کھردرا سستا کاٹن اور مقامی استعمال کے لئے سوتی دھاگے ہیں' اس کے علاوہ کالی مرچیں اور افیم بھی یہاں سے جاتی ہیں۔ جائفل' لونگ اور جوتری کشمیر میں بہت مہنگی ہیں' اس لئے ان کے استعمال سے یہاں کے لوگ ناواقف ہیں۔ جب بادشاہ یہاں ہوتا ہے تو یہ اشیاء یہاں پر لائی جاتی ہیں۔

برہانپور اور گجرات

برہانپور آگرہ سے جنوب کی جانب 300 میل کے فاصلہ پر ہے' جب کہ شمال میں سورت سے اس کا فاصلہ 150 کوس ہے۔ (شمال کو مشرق سمجھنا چاہئے۔ پیلسیے رُٹ نے اپنے نقطہ نظر سے یہ لکھا ہے) یہ ایک بڑا اور کھلا ہوا شہر ہے۔ ماضی میں اس کے اردگرد کوئی فصیلیں نہیں تھیں' لیکن جب دکن کی فوجوں نے شہزادہ خرم کی مدد کے لئے اس کا محاصرہ کیا تو راجہ رتن نے اس کے دفاع کے لئے مٹی کی دیواریں کھڑی کیں اور اس کے کچھ حصوں کے گرد فصیلیں تعمیر کرائیں۔ اسی سال یعنی 1626ء کو جب شاہ جہاں نے' جو کہ اس علاقہ کا گورنر ہے' اپنے چالیس ہزار فوجیوں کے ساتھ دکن پر حملہ کیا تو اس نے لشکر خاں کو حکم دیا کہ وہ اس شہر کے اردگرد فصیلوں کی تعمیر کرائے' چونکہ اس کام کے لئے لوگوں کی کافی تعداد تھی۔ اس لئے تعمیر کا کام بہت جلد مکمل ہو گیا۔ لمبائی میں یہ کوئی 12 کوس ہو گا' مگر اس میں جگہ جگہ کئی برج ہیں۔ یہ تعمیر مٹی سے کی گئی ہے جو کہ دیکھنے میں بڑی مضبوط اور عمدہ ہے۔ دریائے تاپتی جو کہ سورت سے گذرتا ہے اور یہاں سے ہوتا ہوا جاتا ہے' اس میں جگہ جگہ چٹانیں اور بڑے بڑے پتھر ہیں' اس لئے وہ کشتی رانی کے لئے ناموزوں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ شہر کی تجارت کے لئے فائدہ مند ہوتا۔ اگرچہ اب بھی تجارت کافی پھیلی ہوئی ہے مگر سنا ہے کہ ماضی میں یہ اس سے بھی زیادہ اچھی تھی۔ شہر کی تجارت اس وقت زوروں پر تھی کہ جب خان خاناں اور شہزادہ خرم اس کے گورنر تھے۔ چونکہ خرم ایک طاقتور اور عملی کام کرنے والا شہزادہ ہے۔ اس نے اپنے قیام کے دوران دکن کے حکمرانوں سے مقابلہ کے لئے ایک بڑی فوج رکھ رکھی تھی' اور خود اس کا دربار بڑا وسیع اور

عالیشان تھا۔ وہ دست کاروں اور ہنر مندوں کی فیاضی کے ساتھ سرپرستی کرتا تھا اور انہیں بڑی بڑی تنخواہیں دیتا تھا تاکہ اس کا دربار اپنے باپ کے دربار سے مقابلہ کر سکے۔ وہ جہانگیر کی طرح نئی نئی چیزوں کا بڑا شوقین ہے جیسے کہ قیمتی جواہرات اور دوسری نایاب اشیاء' اور ان کے حصول کے لئے وہ فیاضی سے رقم خرچ کرتا ہے۔ لیکن اپنے باپ کی طرح سے وہ لالچی اور دھوکہ باز کارکنوں سے کام نہیں لیتا ہے' بلکہ ہر چیز کا حساب کتاب خود رکھتا ہے۔ اس نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کا باپ مرنے کا نام ہی نہیں لیتا ہے' اس کے خلاف بغاوت کر دی اس کے علاوہ وہ اپنے بڑے بھائی سلطان پرویز کی جگہ لینا چاہتا تھا' لیکن اس کی یہ بغاوت ناکام ہو گئی' اس کے بارے میں'میں نے اپنی تاریخ میں مکمل تفصیل دی ہے۔ جب وہ ایک باغی کی حیثیت سے مفرور تھا تو برہانپور کا علاقہ شہزادہ پرویز کو دیدیا گیا۔ اس کا دور حکومت بڑا ہی مایوس کن تھا' کیونکہ اس کی شخصیت میں کوئی دلکشی نہیں تھی' نہ تو اسے شان و شوکت سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی انتظامی امور کو بہتر بنانے سے۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اسے ہر روز پینے کو شراب ملتی رہے۔ وہ دن بھر سونے اور رات بھر شراب پینے کو پسند کرتا تھا۔ نتیجتاً" اس نے سلطنت کے امور کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ جب اس کی فوج کو تنخواہ نہیں ملی تو فوجیوں کی تعداد ملازمت چھوڑ کر جانے لگی۔ اس وجہ سے جب فوجیوں کی تنخواہیں کم ہوئیں' تو اس کے کارکنوں نے سختی سے لگان وصول کرنا شروع کر دیا' اس نے کسانوں کو تو غریب کر دیا' مگر درباریوں کو امیر سے امیر تر بنا دیا۔

برہانپور میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھی ہوا کرتی تھی کہ جہاں سے مختلف قسم کی تجارتی اشیاء کی فروخت ہوتی تھی' جیسے کہ موٹا اونی کپڑا' سیسہ' ٹن' پارہ' مخمل' اور کاٹن۔ ان میں سے کافی چیزیں فوج کے لئے ہوتی تھیں۔ ان کی فروخت سے جو آمدن ہوتی تھی وہ تمام کی تمام آگرہ یا سورت کی تجارتی کوٹھیوں کو روانہ کر دی جاتی تھی۔ کیونکہ وہاں مقامی طور پر کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ جسے خریدا جا سکے۔ موجودہ بادشاہ

کے مرنے کے بعد اس کے امکانات ہیں کہ یہاں پر ایک ایسی تجارتی کوٹھی قائم کی جا سکے کہ جہاں ان اشیاء کو فروخت کیا جا سکے۔ اس وقت انگریز ایجنٹ وہاں موجود ہیں کہ جو پرانے مال کو ختم کرنے کی فکر میں چاہے اس سے انہیں منافع ہو یا نقصان' ہر صورت میں وہ وہاں سے اپنا کام ختم کرنا چاہتے ہیں۔

سورت:-

سورت کی بندرگاہ' اس سلطنت کی اہم بندرگاہ ہے۔ اگرچہ بندرگاہ سے شہر 7 کوس کے فاصلہ پر ہے' اس لئے تمام درآمد و برآمد کی اشیاء جہازوں یا کشتیوں کے ذریعہ آتی ہیں۔ شہر 2 کوس کے فاصلہ پر مشرق کی جانب ہے جہاں انگریزوں نے جہازوں کو لنگر انداز کرنے کے لئے ایک جگہ بنائی ہے جو کہ سوالی کہلاتی ہے۔ یہاں ساحل پر ریت ہے کہ جس کی وجہ سے پانی کی بڑی موجوں میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے پانی کی سطح ہمیشہ کم رہتی ہے ان خصوصیات کی وجہ سے یہاں پر سامان کو اتارنا اور چڑھانا آسان ہوتا ہے۔ سوالی سے یہ سامان گاڑیوں کے ذریعہ شہر لایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ طریقہ کار بہت مہنگا ہے' مگر اس کے مقابلے میں کشتیوں کے ذریعہ سامان لانا خطرناک ہے' کیونکہ مالا باری بحری ڈاکو اپنی کشتیوں میں سوار اس سامان کو لوٹ لیتے ہیں۔

شہر کی تعمیر خوبصورتی کے ساتھ ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کے اردگرد کوئی دیواریں نہیں' مگر اس کے چاروں طرف خندق ہے۔ شہر کے چار دروازے ہیں۔ سمندر کے سامنے والے حصہ میں ایک قلعہ ہے جو کہ سفید پتھر کی چٹانوں سے بنایا گیا ہے اور اس کی فصیلوں پر توپیں اور دوسرا لڑائی کا سامان ہے۔ اگرچہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ناقابل تسخیر ہے' مگر یہ ایک طویل محاصرہ کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کو مزید مستحکم بنانے کی خاطر' یا توپ خانہ کی مزید سہولت کے لئے' اس کی اندرونی فصیل پر ایک پلیٹ فارم تعمیر کیا ہے' اور یہاں پر تقریباً 30 توپیں رکھ دی گئی ہیں' مگر

دیکھا جائے تو یہ انتظامات ایسے ہی ہیں کہ جیسے کوئی چوہا' چوہے دان میں پھنس جائے' کیونکہ اگر اوپر والا حصہ ٹوٹ جائے' یا اس میں شگاف پڑ جائے' تو اس کے نتیجہ میں اندرونی حصہ' خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہ یا تو گر جائے گا اور اس میں رکھی توپوں کو ناکارہ بنا دے گا' یا دشمن کے سامنے بالکل کھل جائے گا۔

ماضی میں جبکہ یہ جگہ انگریزوں کی پہنچ سے دور تھی' اس وقت یہاں پر تمام تجارت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ لیکن اب یہ جگہ تجارت کے لحاظ سے ختم ہو چکی ہے اور جو کچھ یہ ماضی میں تھی' اس کا مقابلہ زمانہ حال سے بالکل نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ تمام بندرگاہیں جو اب تک تجارتی لحاظ سے مصروف ترین تھیں' وہ آہستہ آہستہ زوال پذیر ہو گئی ہیں' ان کے زوال کی وجہ کچھ تو جنگیں ہیں' اور کچھ دوسری آفات۔ ان بندرگاہوں میں ہرمز' موچہ' عدن' دیبل اور گوا کا تمام ساحلی علاقہ ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے زوال اور غیر استعمال سے کسی اور بندرگاہ کو فائدہ بھی نہیں پہنچا ہے' ورنہ عام طور سے اگر کسی کو نقصان ہوتا ہے تو دوسرا اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان بندرگاہوں کے نقصان اور زوال کے اسباب کا ذمہ دار ہندو اور مسلمان دونوں یا تو ہم کو ٹھہراتے ہیں' یا انگریزوں کو۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم ان کے لئے سمندری بلائیں ہیں کہ جنہوں نے ان کی خوش حالی کو ختم کر دیا ہے۔ اگر کبھی ہم ان کی کمزوریوں کی نشان دہی کرتے ہیں' یا ان کو ڈراتے و دھمکاتے ہیں کہ وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ تو ان کے مشہور تاجر ہم سے یہ کہتے ہیں کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم ان کے ملک میں نہ آئے ہوتے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ماضی میں جہازوں کی بڑی تعداد سورت سے جایا کرتی تھی اور ہر سال بادشاہ کے چار یا پانچ جہاز سامان سے لدے یہاں سے آچن' ہرمز' بنتم اور مڈغاسکر جاتے تھے۔ اس کے علاوہ چھوٹے تاجروں کے کئی جہاز مسلسل آتے اور جاتے رہتے تھے۔ اب ان جہازوں کی تعداد گھٹ کر بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ اب فروری اور مارچ میں بادشاہ کے دو جہاز جاتے ہیں۔ اور یہ اپریل کے آخر میں موچہ کی بندرگاہ پر پہنچتے ہیں کہ جہاں ان کا اسباب خریداروں کی

تلاش میں سال بھر پڑا رہتا ہے۔ اگست میں یہ جہاز واپس ہو جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی جہاز سویز یا مکہ جانے کے لئے ہو' تب یہ موچہ میں سردیاں گذار کر اپنا مال آرام سے فروخت کرتے ہیں۔ واپسی میں یہ جہاز طلائی سکے اور چھوٹا موٹا تجارتی سامان لے آتے ہیں۔ ہر سال ستمبر میں ایک چھوٹا جہاز آچن جاتا ہے اور اس میں دوسری تجارتی چیزوں کے ساتھ کپڑا ہوتا ہے' یہ مارچ میں واپس آتا ہے اور اپنے ساتھ ٹن' کالی مرچیں اور مڈغاسکر سے دوسرے مصالہ جات لاتا ہے۔ ان کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر جہاز یہاں سے نہیں جاتے ہیں۔

چار یا پانچ سال قبل کہ جب سے ہرمز کی بندرگاہ سے پرتگیزیوں کا قبضہ ختم ہوا ہے' تو سورت کے تاجروں کا سامان اب انگریزی جہازوں کے ذریعہ ایران جاتا ہے' یا پھر ہمارے جہاز یہ سامان لے جاتے ہیں۔ جو اشیاء جاتی ہیں ان میں کپڑے' پگڑیاں' پٹکے جو کہ منگاپٹم اور گولکنڈا کی بنی ہوتی ہیں' انہیں اصفہان بھیجا جاتا ہے۔ لیکن یہ جو چیزیں ہمارے جہازوں پر جاتی ہیں وہ ان سے مقابلہ نہیں کرتی ہیں کہ جو ہم لے جاتے ہیں' اس طرح سے اپنا سامان ہمارے جہازوں کے ذریعہ بھیجنے سے انہیں فائدہ ہوتا ہے' مگر اس سے ہمارا بھی کچھ نقصان نہیں ہوتا ہے اور ہم سامان لے جانے کی قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ اکثر تاجر ہمارے جہازوں کے ساتھ اپنا سامان کشتیوں کے ذریعہ روانہ کرتے ہیں' لیکن ان میں سے کسی کو یہ ہمت نہیں ہوتی ہے کہ تنہا اپنی کشتیوں میں سامان بھیجے' کیونکہ سمندر میں پرتگیزی جہاز ہوتے ہیں' جو ان کشتیوں پر قبضہ کر کے ان کا سامان ہڑپ کر لیتے ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے ہرمز کی بندرگاہ اجڑ کر ویران ہو گئی ہے۔

سورت کے مقام پر انگریزوں اور ہماری تجارتی کوٹھیوں کے قیام کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس شہر میں بڑی تجارتی منڈیاں ہیں' بلکہ یہ ہے کہ یہاں پر جہاز اپنا سامان اتار کر جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد یہ اشیاء ان جگہوں تک پہنچائی جاتی ہیں کہ جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہاں پر تجارتی سامان کے ساتھ نقدی بھیجی جائے تو اس کا

کوئی فائدہ نہیں ہو گا' بلکہ یہ کمپنی کے لئے نقصان دہ ہو گا۔ اسی طرح سے یہ کوشش کہ سورت کی منڈی میں مال بیچا جائے' یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ جو بنئے یہاں ہم سے مال خریدیں گے وہ فوراً اسے احمد آباد' برہانپور اور آگرہ بھجوا دیں گے جہاں پہلے سے ہماری تجارتی کوٹھیاں ہیں۔ اور جہاں ہم پورا عملہ ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ سورت میں خریداری کے لئے بھی کوئی اشیاء نہیں ہیں سوائے کچھ ادنی قسم کے کپڑوں کے جو کہ نوسری اور راندر میں بنا جاتا ہے۔ ویسے تو یہاں کچھ نہیں' مگر اس وقت خریداری ہو سکتی ہے کہ جب یہاں پر جہاز آتے ہیں۔ اس موقع پر ہم کپڑے کی مختلف اقسام خرید سکتے ہیں۔ کیونکہ بارشوں کے موسم میں ہمارے پاس اتنا پیسہ نہیں ہوتا ہے کہ ہم بھڑوچ اور احمد آباد سے یہ خرید سکیں۔ یا پھر ہم سود پر روپیہ قرض لیں اور اس سے خریداری کریں۔ بنیوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر سود پر روپیہ دینے کی منافع بخش تجارت شروع کر رکھی ہے اور انہوں نے سود کا نرخ ایک سے بڑھا کر 11/4 کر دیا ہے اگر قرضہ سالانہ بنیاد پر لیا جائے تو یہ سود در سود کی وجہ سے کافی مہنگا پڑے گا۔

یہاں پر تمام درآمد و برآمد پر 31/2 فیصد کسٹم ڈیوٹی ہے۔ 2 فیصد تمام سونے اور چاندی کے سکوں پر ہے۔ اس وقت یہ ڈیوٹی بادشاہ کی جانب سے مقرر کردہ گورنر میر جہاں قلی بیگ جمع کرتا ہے۔ اس سے پہلے یہ رقم مختلف امراء بطور تنخواہ لیا کرتے تھے۔ ڈیوٹی کے یہ نرخ سال میں دو یا تین مرتبہ بدلتے ہیں۔

ناپ تول کے پیمانے ہندوستان کے مقابلہ میں یہاں پر چھوٹے اور ہلکے ہیں۔ یہ پیمانے سورت اور تمام گجرات میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ ماضی میں یہاں پر روپیہ کے بجائے محمودی سکہ چلا کرتا تھا۔ یہ سکہ چھوٹا اور کم قیمت کا ہوتا تھا۔ روپیہ کا استعمال یہاں پر پچھلے پانچ یا چھ سالوں کے دوران ہوا ہے۔ اگرچہ خرید و فروخت میں محمودی کا استعمال اب بھی ہوتا ہے' لیکن روپیہ اب مارکیٹ میں ادائیگی کا اہم ذریعہ ہے۔ شاہی سکوں کے لئے ایک ٹکسال سورت میں بھی ہے' اسی طرح جیسے احمد آباد

اور سلطنت کے دوسرے بڑے شہروں میں ہے۔

بھڑوچ:

سورت سے 20 کوس کے فاصلہ پر ایک چھوٹا شہر ہے' لیکن یہ بلندی پر آباد ہے اور دیکھنے میں شاندار نظر آتا ہے۔ شہر کو سفید دیواروں کے ذریعہ محفوظ کیا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر نہیں بلکہ کوئی قلعہ ہے۔ دور سے دیکھنے میں یہ بڑا دلفریب منظر پیش کرتا ہے۔ اس کی آب و ہوا بھی دوسرے شہروں کے مقابلہ میں زیادہ خوشگوار ہے۔ اس کی وجہ اس کی بلندی ہے جس کی وجہ سے یہاں پر ہوا تازہ اور صاف ہو جاتی ہے۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ شہر کی دیواروں کے پیچھے دریائے نربدا بہتا ہے۔ یہ دریا ہنڈیا سے بہتا ہوا ہندوستان اور دکن کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ اس شہر کی آمدن کا بڑا ذریعہ کپڑے کی صنعت ہے اور یہاں پر سب سے عمدہ بافتہ تیار ہوتا ہے۔ موچہ' موزنبیق' اور جاوا کے لئے یہاں سے ہی کپڑا تیار ہو کر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بڑودہ اور دوسرے قریبی قصبوں اور چھوٹی جگہوں پر بھی برآمد کے لئے کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے کپڑے کی خریداری کے لئے یہاں پر ایک تجارتی کوٹھی کی ضرورت ہے مگر اس کے بدلے میں یہاں پر کچھ فروخت نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ لوگ غریب کاریگر ہیں۔ یہاں جو بھی سامان لایا جاتا ہے' چاہے وہ فروخت کے لئے ہو' یا دوسری جگہ لے جانے کے لئے' اس پر ڈیوٹی دینی پڑتی ہے۔ یہ نرخ 11/2 فیصد ہے سامان کی قیمت کا اندازہ شہر کا قاضی لگاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ غریب تاجروں کو لوٹنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مثلاً اگر لونگ احمد آباد یا آگرہ کے لئے یہاں لائی جائے تو اس پر اسی نرخ سے ڈیوٹی دینی پڑتی ہے جو کہ یہاں کی منڈی میں ہے۔ اگر یہ ڈیوٹی نہ ہو' تو یہ آگرہ لے جانے والے والا سامان برہانپور کے بجائے یہاں سے لے جاتے اور اس پر ہماری لاگت نصف آتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم یا تو اس کے خاتمہ کے لئے کوشش کریں۔ یا بادشاہ سے اس کے لئے معافی کی درخواست دیں۔

(پیلسے رُٹ نے اس کے بعد ان مصالحوں اور ادویات کا ذکر کیا ہے کہ جن کی ضرورت یورپ میں ہے اور جو ہندوستان میں پائی جاتی ہیں' جیسے شورہ۔ اور بورکس وغیرہ)

پیداوار

ہندوستان کی زمین پیداوار کے لحاظ سے انتہائی زرخیز ہے۔ لیکن یہاں پر کسانوں کی حالت انتہائی ابتر ہے۔ اگر کبھی کوئی گاؤں پیداوار کی کمی کی وجہ سے پورا لگان ادا نہ کر پائے تو جاگیردار یا گورنر اسے اس قدر مجبور کرتا ہے کہ اسے ادائیگی کے لئے اپنے بیوی' بچوں کو بیچنا پڑتا ہے ورنہ اسے بغاوت کے جرم میں سزا دی جاتی ہے۔ کچھ کسان اس ظلم و ستم سے گھبرا کر ان زمینداروں اور راجاؤں کے پاس پناہ لیتے ہیں کہ جو پہلے ہی سے باغی ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسانوں کی چھوڑی ہوئی زمینیں خالی اور بنجر ہو جاتی ہیں اور وہاں گھاس پھوس اگ آتی ہے۔ اس قسم کی زیادتیاں اس ملک میں بہت عام ہیں۔

یہاں سال میں تین موسم ہوتے ہیں۔ اپریل' مئی' اور جون میں ناقابل برداشت گرمی ہوتی ہے یہاں تک کہ آدمی کو سانس لینا بھی دشوار ہوتا ہے۔ اس پر مصیبت یہ ہوتی ہے کہ سخت لو چلتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہنم سے نکل کر آ رہی ہو۔ اس موسم میں اکثر سخت آندھیاں آتی ہیں کہ جو دن کو اس قدر اندھیرا کر دیتی ہیں کہ اس میں کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ مثلاً 15 جون 1624ء میں میں نے ایک ایسی آندھی کا مشاہدہ کیا جو کہ آہستہ آہستہ آئی اور جلد ہی اس نے آسمان اور سورج کو ریت سے ڈھک دیا۔ تقریباً دو گھنٹہ تک یہ حالت رہی اور لوگوں کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا ان کا خاتمہ ہونے والا ہے' کیونکہ ہوا اور طوفان اس قدر سخت تھا کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں تھا۔ پھر یہ طوفان آہستہ آہستہ کم ہوا جیسا کہ آیا تھا اس کے خاتمہ پر سورج دوبارہ سے چمکنے لگا اور اندھیرے کے بعد پھر سے روشنی ہو گئی۔

جون' جولائی' اگست' ستمبر اور اکتوبر کے مہینے برسات کا موسم لے کر آتے ہیں۔ اس موسم میں کبھی کبھی تو دن رات مسلسل بارش ہوتی رہتی ہے۔ اس موسم میں بھی اگرچہ گرمی ہوتی ہے مگر بارشیں خوشگوار تبدیلی لے آتی ہیں۔ نومبر' دسمبر' جنوری' فروری اور مارچ کے مہینوں میں سردی ہوتی ہے اور موسم اچھا ہو جاتا ہے۔

اپریل سے جون تک کھیت سخت اور خشک ہو جاتے ہیں اور اس زمانہ میں ہل چلانا اور بیج بونا مشکل ہوتا ہے۔ جب بارش کی وجہ سے زمین گیلی ہو جاتی ہے تو اس وقت نیل' چاول' اناج مختلف اقسام' جن میں جوار' باجرہ' کنگری' دالیں اور جانوروں کے چارے کے لئے موٹھ' مونگ' اور اڑد وغیرہ بوئی جاتی ہیں۔ اسی زمانہ میں ایسے بیجوں کی کاشت ہوتی ہے کہ جن سے تیل نکالا جاتا ہے۔ جب یہ فصل تیار ہو کر کاٹ لی جاتی ہے تو کسان دوبارہ سے ہل چلاتے اور بیج ڈالتے ہیں۔ کیونکہ یہاں سال میں دو فصلیں ہوتی ہیں' یعنی دسمبر اور جنوری میں یہ گیہوں جو اور دالوں کی مختلف اقسام بوتے ہیں۔ جیسے چنا' مسور' مٹر' اور تیل کے بیج جیسے سرسوں اور السی۔ کھیتوں میں آب پاشی کے لئے بڑی تعداد میں کنویں کھودے جاتے ہیں' کیونکہ سردیوں میں پانی کی کمی ہو جاتی ہے۔ اگر موسمی بارشیں ہو جائیں' اور زیادہ سردی نہ پڑے' تو پیداوار اچھی ہوتی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف کھانے کی چیزیں وافر مقدار میں ملتی ہیں بلکہ اس کی وجہ سے تجارت کو بھی فروغ ہوتا ہے۔ اس موسم میں مختلف قسم کی ترکاریاں بھی کافی مقدار میں پیدا ہوتی ہیں۔ پھلوں کے درختوں کی یہاں پر کمی ہے' اس کی وجہ زمین کا شور ہونا ہے۔ اس لئے ہر قسم کے پھل قندھار یا کابل سے آتے ہیں۔

بڑے اور مالدار امراء اپنے باغوں میں انگور کی بیلیں لگاتے ہیں' مگر وہ تین سال میں کوئی ایک سال ایسا ہوتا ہے کہ اس میں انگور آتے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں نارنگیاں بڑی مقدار میں ہوتی ہیں' اور یہ جولائی تک بازار میں دستیاب ہوتی ہیں۔ یہ سائز میں کافی بڑی ہوتی ہیں' خصوصیت سے جو کہ بیانہ کی حدود میں کاشت ہوتی ہیں۔ اسی طرح لیموں بھی بہت ہوتے ہیں۔ دوسرے پھلوں کے بارے میں اس لئے کہنا

فضول ہے کہ یہ یا تو بہت کم ہوتے ہیں' یا بد ذائقہ۔

گوشت کی سپلائی یہاں بھی ہالینڈ کی طرح ہے۔ اگرچہ یہاں پر یہ سستا ہے۔ بھیڑیں' بکریاں' تیتر' بطخیں' اور ہرنوں کا گوشت بازار میں ملتا ہے۔ چونکہ گوشت کی سپلائی بہت ہے' اس لئے قیمت بھی کم ہے بیلوں اور گایوں کی قربانی نہیں کی جاتی ہے کیونکہ ایک تو ان کے ذریعہ کاشت کی جاتی ہے دوسرے بادشاہ کی جانب سے ان کی قربانی کی سخت ممانعت ہے اور اس کی سزا موت ہے۔ اس کے مقابلہ میں بھینسوں کی قربانی کی جاتی ہے۔ گائے کی قربانی کی ممانعت بادشاہ نے اپنی ہندو رعایا کو خوش کرنے کے لئے کی ہے کیونکہ وہ گائے کو دیوی اور مقدس مانتے ہیں۔ اکثر ہندو رشوت دے کر یا سفارش کر کے بادشاہ یا گورنر سے ایسا فرمان بھی جاری کرا لیتے ہیں کہ جس کے تحت ایک خاص مدت تک مچھلی پکڑنے پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے یا یہ پابندی لگا دی جاتی ہے کہ کچھ دنوں تک بازار میں کسی قسم کا گوشت نہیں بیچا جائے گا۔ اس قسم کے احکامات عام لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث ہوتے ہیں' جہاں تک امراء کا تعلق ہے تو وہ ہر روز اپنی پسند کے جانور گھروں میں ذبح کرتے رہتے ہیں۔ یہ ملک اس لحاظ سے اچھا ہے کہ یہاں پر کھانے و پینے کی چیزوں کی بہتات ہے اور وہ ہمارے جیسے سرد ملک کے لوگوں کی طرح اچھی خوراک سے اپنی تسکین کر سکتا ہے۔ لیکن جب گرمیوں کا موسم آتا ہے تو کھانے کی خواہش کم ہو جاتی ہے اور صرف پانی پینے کو دل چاہتا ہے جس کی وجہ سے انسانی جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ بحث غیر متعلق ہے' اس لئے میں اسے یہیں پر ختم کر کے آگے بڑھتا ہوں۔

انتظام سلطنت

انتظام سلطنت کے بارے میں میری یہ رپورٹ مکمل نہیں ہے' کیونکہ موجودہ بادشاہ کے بارے میں پوری تفصیل دینا ممکن نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ انتظام کا ذکر کرتے ہوئے حکمراں خاندان کی ابتداء کے بارے میں بتایا جائے' چونکہ میرا ارادہ اسے علیحدہ سے لکھنے کا ہے' اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں پر تفصیل میں جانا لاحاصل ہے۔ جہانگیر کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اس نے اپنی شخصیت کو ختم کر کے خود کو اپنی چالاک بیوی کے حوالہ کر دیا ہے کہ جس کا تعلق ایک کم تر خاندان سے ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا ہے کہ یا تو وہ زبان کی بڑی میٹھی ہے یا پھر اسے شوہر کو قابو کرنے کے حربے آتے ہیں۔ اس نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور "قسیحنا" اس نے آہستہ آہستہ خود کو بے انتہا مالدار بنا لیا ہے۔ اس وقت اس کی حیثیت شاہی خاندان کے کسی بھی فرد سے زیادہ ہے۔ اس کے وہ تمام حمایتی جو اس کے ساتھ ہیں' انہیں بھی بے انتہا مراعات سے نوازا گیا ہے۔ اس لئے وہ تمام امراء اور مصاحب جو اس وقت بادشاہ کے قریب ہیں۔ وہ سب اس کے آدمی ہیں اور اسی کی سفارش سے ان کو ترقیاں ملی ہیں۔ چونکہ یہ تمام عہدے دار اس کے احسان مند ہیں' لہٰذا بادشاہ تو برائے نام ہے۔ ورنہ تمام اختیارات اس کے اور اس کے بھائی آصف خاں کے پاس ہیں اور اس وجہ سے سلطنت پر ان کو پورا پورا کنٹرول ہے۔ بادشاہ کے کسی فرمان اور حکم کی اس وقت تک تعمیل نہیں ہوتی ہے کہ جب تک ملکہ کی اس پر تصدیق نہ ہو۔ اگر انہوں نے دولت و شہرت و اقتدار سب کچھ حاصل کر لیا ہے' مگر ان کی خواہشات اور ہوس کی کوئی انتہا نہیں ہے اور وہ جو کچھ ان کے پاس

ہے اس سے بھی زیادہ کے خواہش مند ہیں۔ نورجہاں نے اپنی شہرت کی خاطر مملکت کے ہر حصے میں قیمتی سرائے تعمیر کرائے ہیں۔ جہاں کہ تاجروں کے قیام و طعام کا بندوبست ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے خوبصورت باغات اور محلات بھی بنوائے ہیں۔

جہاں تک بادشاہ کا تعلق ہے اسے انتظام سلطنت سے اب کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے۔ اگر کوئی شخص بادشاہ کے دربار میں باریابی چاہتا ہے تو بادشاہ اس کی بات تو غور سے سنتا ہے مگر اس کا جواب نہ تو ہاں میں دیتا ہے اور نہ میں بلکہ اسے آصف خاں کے حوالہ کر دیتا ہے کہ وہ اس کا معاملہ طے کرے۔ آصف خاں کا بھی دستور ہے کہ وہ بات کو سن کر کوئی جواب نہیں دیتا ہے' بلکہ اس سلسلہ میں اپنی بہن سے مشورہ کرتا ہے۔ جو اس معاملہ کو اس طرح سے سلجھاتی ہے کہ جس سے معاملہ بھی طے ہو جاتا ہے' اور بادشاہ و آصف خاں کی اتھارٹی بھی متاثر نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے جس کا بھی کام ہو جاتا ہے وہ بادشاہ کے بجائے ان دونوں کا شکر گذار ہوتا ہے۔ بادشاہ کو صرف ایک ہی کام سے دلچسپی ہے اور اس تلاش میں رہتا ہے کہ شکار کہاں پر اچھا ملتا ہے۔ شکار بادشاہ کی زبردست کمزوری ہے اور اس شغل سے وہ بے انتہا خوش ہوتا ہے۔

شکار کو وہ یا تو پچھلے پہر کو جاتا ہے کہ جب سورج کی حدت کم ہو جاتی ہے یا پھر جب اس کی آنکھ کھل جائے۔ وہ فوراً لباس تبدیل کرتا ہے اور گھوڑے یا ہاتھی پر سواری کرتے ہوئے شکار کے لئے روانہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسے اس کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ کتنے ملازم ہیں' یا کوئی ہے بھی یا نہیں۔ نہ ہی اسے موسم کے بارے میں فکر ہوتی ہے کہ بارش ہے یا آندھی' وہ شکار سے اس وقت تک واپس نہیں آتا ہے کہ جب تک اس کے باز اور چیتے کوئی شکار نہ پکڑ لیں۔ چیتے یا تیندوے کے ذریعہ شکار کھیلنا ہندوستان کا ایک شاندار طریقہ ہے۔ ان جانوروں کو اس قدر سدھا لیا جاتا ہے کہ وہ بلیوں کی طرح انسانوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان کی بڑی عمدگی سے دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ جس کے لئے ہر جانور کے لئے دو ملازم مقرر

ہوتے ہیں۔ وہ اس کی اس گاڑی کی بھی دیکھ بھال کرتے ہیں کہ جن میں بٹھا کر انہیں شکار کے لئے لایا جاتا ہے۔ جب وہ ایسی جگہ پر آتے ہیں کہ جہاں ہرنی' چیتل' یا سانبھر ہوتے ہیں۔ تو ان کا نگراں انہیں گاڑی سے اتار کر اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ جہاں شکار ہوتا ہے۔ وہ خاموشی سے جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ میں چھپتا ہوا اپنے شکار کی طرف بڑھتا ہے اور جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہی چھلانگ میں اپنے شکار کو پکڑ لے گا تو اس وقت وہ حملہ کرتا ہے۔ یہ چیتے اس قدر تربیت یافتہ ہوتے ہیں کہ یہ کم ہی اپنے شکار کو چھوڑتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ بادشاہ ہرن' یا سانبھر کو ان ہی کے ذریعہ شکار کرتا ہے۔ اس صورت میں ان جانوروں کو اس طرح سے تربیت دی جاتی ہے کہ جب بھی ان کا نگراں انہیں آواز دے کر بلاتا ہے وہ فوراً اس پر واپس آ جاتے ہیں۔ جب ان کے ذریعہ شکار کرنا ہو تو ان کے سینگوں میں پھندا ڈال دیا جاتا ہے۔ جب وہ کسی جنگلی ہرن یا سانبھر کو دیکھتا ہے تو اس سے لڑنے کے لئے اپنے سینگوں کو اس کے سینگوں میں پھنساتا ہے' وہ اس طرح آپس میں لڑتے ہیں' یہاں تک کہ اس کے سینگوں کا پھندا جنگلی ہرن یا سانبھر کے سینگوں کو پھنسا لیتا ہے۔ اب جنگلی جانور کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا ہے کہ وہ بھاگ سکے' اس لئے جو لوگ جھاڑیوں میں چھپے یہ تماشہ دیکھتے ہوتے ہیں۔ وہ آتے ہیں۔ اور آرام سے اسے زندہ پکڑ لیتے ہیں۔ اس قسم کے شکار کے طریقوں سے یہ لوگ بے انتہا لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ جنگلی ہرن یا سانبھر اس آسانی سے قابو میں نہیں آتا ہے اور وہ خود کو بچانے اور بھاگنے کی غرض سے اس شدت سے لڑتا ہے کہ گر کر مر جاتا ہے۔

جب بادشاہ جوان تھا تو اس وقت وہ شوٹنگ کو شکار کے دوسرے طریقوں پر ترجیح دیتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا نشانہ بہت اچھا ہے ان جنگلوں میں کہ جہاں سور' شیر' چیتے اور دوسرے خطرناک جانور ہوتے تھے جب بادشاہ کو ان کے بارے میں بتایا جاتا تھا تو وہ فوراً وہاں جاتا اور ان کا شکار کرتا تھا۔ شیر اور چیتوں کے شکار

ممانعت ہے، کوئی شخص صرف اسی وقت ان کا شکار کر سکتا ہے کہ جب وہ خصوصی طور سے بادشاہ سے اس کی اجازت لے۔ اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ بادشاہ شکار کے لئے آگرہ کے قریب ایک مقام پر گیا ہوا تھا کیونکہ اس نے ایک شیر کے بارے میں سنا تھا کہ جو لوگوں پر حملے کر کے انہیں مار ڈالتا تھا جس کی وجہ سے اس علاقہ میں کافی خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ اس موقع پر حکم یہ تھا کہ کوئی بھی شیر کو چاہے وہ اس پر حملہ کیوں نہ کرے، خنجر کے علاوہ کسی اور ہتھیار سے نہیں مارے۔ بادشاہ خود اپنے عملہ کے درمیان بندوق لئے ہوئے تھا، جب کہ امراء اور دوسرے لوگ ہانکے کے لئے بکھرے ہوئے تھے۔ اس موقع پر ہوا یہ کہ شیر نے اچانک ایک جھاڑی سے چھلانگ لگائی اور بادشاہ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت اس کے ایک ہندو مصاحب نے کہ جس کا نام انی رائے تھا، یہ دیکھتے ہوئے کہ بادشاہ کی زندگی خطرے میں ہے اور وہ اس قابل نہیں ہے کہ اپنی بندوق استعمال کر سکے۔ وہ آگے بڑھا اور شیر کو گردن سے پکڑ لیا اور بادشاہ کو چھڑانے کے لئے خود اس سے الجھ پڑا۔ اس مقابلہ میں شیر نے اس کے بازو اور ٹانگوں کا گوشت نوچ لیا، اگرچہ بادشاہ نے شیر پر تلوار سے کئی مرتبہ وار کئے، مگر اس نے انی رائے کو نہیں چھوڑا۔ آخرکار دوسرے لوگ ہنگامہ و شوروغل سن کر ادھر آئے اور انی رائے کو شیر سے چھڑایا۔ بادشاہ نے اس کے علاج کی طرف خصوصی توجہ دی، اور اس کے صحت یاب ہونے پر اسے 500 سواروں کا منصب دار مقرر کیا۔ اس نے اپنی بہادری کی وجہ سے ترقی کی اور اس وقت وہ 3000 سواروں کا منصب دار ہے۔ اگرچہ اس قسم کے واقعات دوسرے ملکوں میں بھی ہوتے ہیں۔ مگر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ جو محبت اور عقیدت یہاں کے ملازمین میں ہے وہ شاید اور کہیں نہ ہو کہ وہ اپنے مالک اور آقا کے لئے اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہیں۔ اس لئے اب میں پھر اپنی بات پر واپس آتا ہوں۔

بادشاہ جب شکار سے واپس آتا ہے تو وہ غسل خانہ (جہاں بادشاہ خاص خاص

امراء سے ملتا تھا) میں آکر بیٹھتا ہے کہ جہاں تمام امراء اس کے سامنے آکر حاضری دیتے ہیں۔ یہاں پر ان لوگوں کو بھی شرف بازیابی ملتا ہے کہ جو بادشاہ سے ملنے کی خصوصی درخواست کرتے ہیں۔ وہ یہاں پر ایک پہر رات یا جب تک اس کی مرضی ہو' رہتا ہے۔ اس دوران میں وہ شراب کے تین پیالے پیتا ہے۔ شراب پینے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ایک کے بعد ایک تین بار تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ شراب نوشی کے دوران جو بھی محفل میں حاضر ہوتا ہے وہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے شراب نوشی کو بادشاہ کی صحت کے لئے ضروری سمجھتا ہے' اسی طرح جیسے ہمارے ملک میں کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کی شراب نوشی میں رحمت ہے۔ جب بادشاہ آخری پیالہ پی کر سو جاتا ہے تو اس وقت تمام حاضرین بھی رخصت ہو جاتے ہیں۔ امراء کے جانے کے بعد ملکہ معہ کنیزوں کے آتی ہے' اور اس کے کپڑے تبدیل کراتی ہے۔ یہ تین پیالے اس کو اس قدر مدہوش اور مسرور کر دیتے ہیں کہ وہ اس کے بعد جاگنے کے بجائے سونا پسند کرتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ جب اس کی ملکہ اس سے جو چاہتی ہے وہ منظور کرا لیتی ہے' کیونکہ بادشاہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتا ہے کہ وہ اس کی بات سے انکار کرے۔

بادشاہ کے تمام علاقوں' شہروں اور گاؤں وغیرہ کی سالانہ آمدنی کا حساب ایک رجسٹر میں لکھا جاتا ہے جو کہ دیوان کے چارج میں ہوتا ہے۔ اس وقت موجودہ دیوان ابوالحسن ہے تمام شہزادوں' منصب داروں' اور امیروں کو ان کی حیثیت کے مطابق جاگیریں دی جاتی ہیں کہ جس کی آمدن سے وہ اپنا خرچہ پورا کرتے ہیں۔ ان میں کچھ امراء بادشاہ کے دربار میں رہتے ہیں' اور اپنی جاگیر کا انتظام اپنے کسی معتمد کے حوالے کر دیتے ہیں یا وہ کسانوں یا کروڑی کو دے دیتے ہیں۔ کہ جو اچھی یا خراب فصل پر نفع و نقصان کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ لیکن صوبے اس قدر غریب ہیں کہ ایک جاگیر جس کی آمدن 50'000 تصور کر لی جاتی ہے' وہ درحقیقت 25'000 مشکل سے وصول کرتی ہے۔ اور یہ بھی اس صورت میں کہ غریب کسانوں کو بالکل نچوڑ لیا جاتا

ہے اور ان کے کھانے کو خشک روٹی مشکل سے پہنچتی ہے کہ جس سے وہ اپنا پیٹ بھر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن منصب داروں کو 5000 سوار رکھنا چاہئیں وہ مشکل سے 1000 سوار رکھ سکتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی شان و شوکت اور رعب داب کے لئے ہاتھی' گھوڑے اور ملازمین کی ایک تعداد رکھتے ہیں تاکہ وہ عام آدمی کے بجائے بارعب امیر لگیں اور جب ان کی سواری نکلے تو ان کے ملازمین بلند آواز میں لوگوں کو سامنے سے ہٹاتے رہیں۔ ایسے موقعوں پر جو لوگ راستے سے نہیں ہٹتے ہیں۔ انہیں ملازم بلا کسی لحاظ کے مارتے پیٹتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ان امراء کی لالچ اور طمع کی کوئی انتہا نہیں ہے ہر وقت ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ کس طرح زیادہ سے زیادہ دولت جمع کریں چاہے اس میں انہیں لوگوں پر ظلم و ستم کرنا پڑے' یا ناانصافی سے کام لینا پڑے۔ دستور یہ ہے کہ جیسے ہی کوئی امیر مرتا ہے' تو دیکھے بغیر کہ وہ معمولی امیر تھا' یا مقرب خاص' بادشاہ کے آدمی فوراً اس کے محل میں جاتے ہیں' اور اس کے مال و اسباب و سازوسامان کی ایک فہرست تیار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ خواتین کے زیورات اور ان کے ملبوسات کو بھی نہیں چھوڑا جاتا ہے' بشرطیکہ انہیں چھپا کر نہیں رکھا جائے۔ امیر کے مرنے پر بادشاہ اس کی جاگیر کو واپس لے لیتا ہے' اس صورت میں عورتوں اور بچوں کو گذارے کے لئے معقول رقم دیدی جاتی ہے۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔ اس کا امکان کم ہوتا ہے کہ بچے اور خاندان والے امیر کی زندگی میں اس کی دولت کا کچھ حصہ چھپا دیں تاکہ وہ بعد میں ان کے کام آئے۔ یہ اس لئے مشکل ہوتا ہے کیونکہ ہر امیر کی جائداد اس کی آمدن اور اس کی دولت کے بارے میں اس کے دیوان کو پورا پورا پتہ ہوتا ہے کیونکہ وہی اس کی آمدن کا حساب کتاب رکھتا ہے اور اسی کے ہاتھوں تمام کاروبار چلتا ہے۔ دیوان کے ماتحت کئی لوگ ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہاں یہ دستور ہے کہ جو کام ایک آدمی کر سکے۔ اس کے لئے دس ملازم رکھے جائیں۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک خاص کام ہوتا ہے۔ اور اب یہ اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ امیر کے

مرنے کے بعد وہ اس کا حساب کتاب دے۔ اگر ضرورت پڑے تو متوفی امیر کے عملہ کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ حساب کتاب کے تمام کاغذات پیش کریں اور یہ بتائیں کہ ان کے آقا کی آمدنی و اخراجات کیا تھے۔ اگر وہ کچھ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کو اس وقت تک اذیت دی جاتی ہے کہ جب تک وہ سب کچھ نہ بتا دیں۔ اب آپ ذرا ایک ایسے شخص کے بارے میں سوچئے کہ جو ایک وقت میں سر پر ٹیڑھی ٹوپی رکھے بارعب انداز میں رہتا ہے اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ اس کے قریب جائے مگر وقت کے بدلتے ہی وہی شخص پھٹے پرانے کپڑوں اور زخمی چہرے کے ساتھ ادھر سے ادھر پریشان حال بھاگتا پھرتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایسے شخص کے لئے اسی قسم کی ملازمت کا حصول مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ درحقیقت زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ میں اس قسم کے کئی لوگوں سے ذاتی طور پر واقف ہوں کہ جو اس اذیت سے گذرے ہیں اور اب غربت کی زندگی گذار رہے ہیں۔

میں اکثر امراء سے جو میرے دوست ہیں' یہ سوال کرتا ہوں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ تم لوگ اس قدر محنت و مشقت کر کے دولت جمع کرتے ہو' جب کہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ دولت نہ تو تمہارے کام آسکے گی اور نہ تمہارے خاندان والوں کے' اس کے جواب میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ یہ سب کچھ وقتی طور پر دنیا کو دکھلانے کے لئے کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی شہرت میں اس وجہ سے اضافہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مرنے کے بعد اپنی جائداد میں اس قدر دولت چھوڑی ہے۔ میں ان سے کہا کرتا ہوں کہ اگر انہیں اپنی شہرت اور عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو انہیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کے دوست اور خاندان والے چونکہ ان کی جمع شدہ دولت سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے اس لئے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ اس میں ان غریبوں کو شامل کریں کہ جن کی تعداد اس ملک میں بے شمار ہے۔ اور اس بات کی کوشش کریں کہ وہ لوگوں کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کریں۔

ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کریں' تاکہ عوام کو ان سے کوئی خوف نہ ہو۔ لیکن جب بھی میں یہ دلائل پیش کرتا ہوں تو وہ یہ کہہ کر بحث کا خاتمہ کر دیتے ہیں کہ یہ ان کے ملک کا رواج ہے۔

بادشاہ اور خصوصیت سے ملکہ کا یہ دستور ہے کہ وہ اس سپاہی کو بہت جلد ترقی دے کر اعلیٰ منصب پر فائز کر دیتے ہیں۔ چاہے اس کا رتبہ کتنا کم کیوں نہ ہو۔ بشرطیکہ اس نے وفاداری اور جرات کے ساتھ ان کی خدمت کی ہو اور میدان جنگ میں نمایاں کارنامے کئے ہوں۔ دوسری طرف کسی کی ذرا سی غلطی یا بھول چوک اسے آن واحد میں اوپر سے نیچے گرا دیتی ہے اور وہ شخص یا تو اپنی دولت و مرتبہ سب کھو دیتا ہے یا اسے پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس لئے اس مملکت میں ہر چیز غیر یقینی کیفیت میں ہے دولت' مرتبہ' محبت' دوستی' اور اعتماد' ہر چیز ایک نازک دھاگے سے اٹکی ہوئی ہے۔ کوئی چیز مستقل نہیں ہے' یہاں تک کہ شاندار عمارتیں بھی۔ باغات' مقبرے' اور محلات' جو ہر شہر کے اندر یا قرب و جوار میں واقع ہیں' ان کے بارے میں سوچتے ہوئے انسان غم و اندوہ کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے' کیونکہ یہ ویران و خستگی کی حالت میں کھڑے ایک المیہ نظر آتے ہیں۔ ان کو جب تعمیر کیا جاتا ہے تو ان پر ہزاروں اور لاکھوں کا خرچہ ہوتا ہے' ان کی مرمت اس وقت تک کی جاتی ہے کہ جب تک اس کے مالک زندہ رہتے ہیں اور ان کے پاس اتنی دولت ہوتی ہے کہ وہ ان کی دیکھ بھال کر سکیں۔ لیکن جیسے ہی مالک کی وفات ہوتی ہے' پھر ان عمارتوں کی جانب کسی کی توجہ نہیں رہتی ہے۔ بیٹا اپنے باپ کے کام کو نظر انداز کرتا ہے ماں بیٹے کے' بھائی اور دوست دوسرے کی عمارتوں کی کوئی دیکھ بھال نہیں کرتے ہیں۔ ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی نئی عمارت تعمیر کرائے اور اپنے آباؤ اجداد کی روش پر چلتے ہوئے علیحدہ سے اپنی شہرت اور نام کو بڑھائے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایک صدی تک ان عمارتوں کی مرمت کی جائے' ان کی دیکھ بھال کی جائے' تو ہر شہر اور ہر گاؤں میں شاندار عمارتیں نظر آئیں۔ لیکن صورت حال یہ ہے

کہ آپ جب سفر کریں تو آپ کو شاہراہوں پر اور شہروں سے باہر ٹوٹی عمارتوں کے ڈھانچہ اور ان کا گرا ہوا ملبہ اور اس کے ڈھیر جگہ جگہ نظر آئیں گے۔

جہاں تک اس ملک میں قانون کا تعلق ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کوئی قانون نہیں ہے۔ انتظام سلطنت میں مطلق العنانیت ہے' لیکن قانونی کتابیں ضرور ہیں کہ جو قاضی کے پاس ہوتی ہیں۔ ان قوانین کے تحت سزاؤں میں ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور آنکھ کے بدلے آنکھ لینے پر عمل ہوتا ہے۔ لیکن جیسا ہمارے ہاں ہے وہ کون ہے کہ جو پوپ کو عیسائیت سے نکالے؟ اس طرح یہاں کسی کی مجال نہیں کہ وہ صوبہ کے عامل سے یہ سوال پوچھ سکے کہ "تم ہم پر اس طرح کیوں حکومت کرتے ہو؟ جب کہ ہمارا قانون تو یہ مطالبہ کرتا ہے۔"

انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے' ہر شہر میں کچہری یا عدالت لگتی ہے کہ جہاں عامل' دیوان' منشی' کوتوال' اور قاضی یہ سب موجود ہوتے ہیں۔ یہ اجلاس یا تو روز ہوتے ہیں' یا ہفتہ میں چار روز۔ یہاں پر تمام مقدموں کا فیصلہ کیا جاتا ہے' لیکن ان فیصلوں اپنے حق میں کرانے کے لئے رشوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ قتل' چوری وغیرہ کے مقدمات کا فیصلہ گورنر یا عامل خود کرتا ہے۔ اگر مجرم غریب ہوں اور رشوت دینے کے قابل نہ ہوں تو انہیں بھنگی فوراً عدالت سے باہر گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ اور بغیر کسی تکلف کے انہیں پھانسی دیدی جاتی ہے۔ اگر وہ دولت مند ہوں تو ایسے لوگوں کے لئے سزائے موت پر عمل درآمد نہیں ہوتا ہے۔ اس جرم کی سزا کے طور پر ان کی جائداد کو ضبط کر کے گورنر یا کوتوال کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔

عام قسم کے مقدمات جیسے خاندانی لڑائی جھگڑے' طلاق اور دھمکیوں وغیرہ کو کوتوال یا قاضی نمٹا دیتے ہیں۔ مجھے ایسے شخص پر ترس آتا ہے کہ جو ان بے دینوں اور انصاف سے دور منصفوں کے سامنے انصاف کی غرض سے پیش ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی آنکھوں میں دولت کی لالچ چمکتی نظر آتی ہے ان کے سینہ دولت کی ہوس کے لئے بھیڑیوں کی طرح کھلے ہوتے ہیں اور ان کے پیٹ غریبوں کی روٹی کھانے کے لئے

بھوک سے بے چین رہتے ہیں۔ عدالت میں ہر شخص ہاتھ پھیلائے مانگنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ کسی پر اس وقت تک نہ تو رحم کیا جاتا ہے اور نہ ترس کھایا جاتا ہے کہ جب تک وہ شخص رشوت نہ دیدے۔ اس سلسلہ میں ججوں اور عہدے داروں کو ہی قصور وار ٹھہرانا مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ وبا پلیگ کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی ہے' چھوٹے سے لے کر بڑے تک یہاں تک کہ بادشاہ بھی اس میں ملوث ہے۔ ہر شخص دولت کی ہوس میں اس قدر گرفتار ہے کہ اس کی خواہش کبھی پوری ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس لئے اگر کسی شخص کو عامل سے یا سرکار میں کچھ کام ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رشوت کے لئے پیسوں کا بندوبست کرے۔ بغیر تحفہ تحائف کے لئے اس کی درخواست پر عمل در آمد ہونا ناممکن ہے۔ ہمارے عزت ماب لوگوں کو اس پر حیران نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ اس ملک کا رواج ہے۔

بادشاہ کے فرمان جو وہ شہزادوں اور امراء کو لکھتا ہے وہ ان تک تیز رفتاری کے ساتھ پہنچا دئے جاتے ہیں۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ ڈاکیہ یا قاصد جو کہ دوڑ میں ماہر ہوتے ہیں وہ ہر گاؤں میں چار یا پانچ کوس کے فاصلہ پر متعین ہوتے ہیں یہ ان کے فرائض میں سے ہے کہ وہ دن اور رات ہر وقت اپنے کام کے لئے تیار رہیں۔ اس لئے جیسے ہی کوئی ڈاکیہ بھاگتا ہوا خط لے کر ان کی پوسٹ پر آتا ہے وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اسے لے کر دوسری پوسٹ کی طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ اس طرح فرمان و شاہی احکامات و خطوط دن رات میں 80 کوس کا فاصلہ طے کرتے ہیں اور اس تیز رفتاری کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ملک کے ہر حصہ میں بادشاہ کی جانب سے تربیت یافتہ کبوتر ہوتے ہیں کہ جو کسی بحران یا ضرورت کے وقت پیغامات لے کر جاتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے خاص طور سے محاصرہ کی صورت میں' لیکن صرف تھوڑے فاصلے کے لئے۔ لیکن موجودہ بادشاہ ان کبوتروں کو دور دراز کے علاقوں کے لئے بھی استعمال کرتا ہے۔

موجودہ بادشاہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مالک ہے لمبائی میں یہ سورت سے کشمیر تک 1100 کوس ہے' وہاں تک پہنچنے کے لئے جو چوکیاں ہیں وہ یہ ہیں : سورت سے برہانپور 150 کوس' آگرہ 350 کوس' آگرہ سے لاہور 300 کوس' لاہور سے کشمیر 300 کوس۔ اگر احمد آباد سے جایا جائے تو 50 کوس کم ہو جائیں گے۔ اگر شمال مغربی علاقے میں جایا جائے تو لاہور سے ملتان ہوتے ہوئے قندھار کا فاصلہ 600 کوس ہے۔ مشرق میں اگر جایا جائے تو آگرہ سے 1000 کوس کا فاصلہ ہے جو بنگال اور اوڑیسہ تک جاتا ہے۔ مغرب میں کابل ہے جو کہ لاہور سے 300 کوس ہے۔ جنوب مغرب میں ٹھٹھہ' سندھ اور بھکر ہیں۔ اگر ان تمام علاقوں سے منصفانہ طور پر لگان لیا جائے تو اس سے جہانگیر کو اس قدر آمدنی ہو سکتی ہے کہ وہ اس کی مدد سے تمام ہمسایہ ملکوں کو فتح کر سکتا ہے۔ لیکن بہرحال ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ وہ میدانی علاقوں اور کھلی شاہراہوں کا بادشاہ ہے۔ کیونکہ بہت سے ایسے علاقے ہیں کہ جہاں بغیر حفاظتی دستے کے سفر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پھر اس علاقے کے باغیوں کو حفاظت سے گذرنے کے لئے بھاری رقم دینی پڑتی ہے۔

اس ملک کے علاقے پہاڑوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے کٹ گئے ہیں' اس لئے جو لوگ ان پہاڑوں کی دوسری طرف رہتے ہیں' یا ان کی وادیوں میں' انہیں نہ تو کسی بادشاہ کا پتہ ہے' اور نہ ہی وہ جہانگیر کو جانتے ہیں کہ وہ کون ہے؟ وہ صرف اپنے راجہ کو حکمراں تسلیم کرتے ہیں' اور ایسے راجاؤں کی تعداد بہت ہے' اور اس طرح یہ ملک ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہے۔ اس لئے جہانگیر کہ جس کے معنی پورے عالم پر حکمراں کے ہیں' پورے ہندوستان پر حکومت نہیں کرتا ہے' اور اس کی حکومت کے باہر بہت چھوٹے حکمراں' یا اس کی حکومت کے باغی ہیں۔ مثلاً سورت کی مثال لیجئے' یہاں پر راجہ پیپل نے ایک مرتبہ حملہ کیا اور شہر میں گھس کر اس نے نہ صرف لوٹ مار کی بلکہ قتل و غارت گری سے بھی باز نہیں آیا اور قریبی گاؤں کو آگ لگا کر تباہی پھیلا دی۔ اس طرح سے الہ آباد' برہانپور' آگرہ' دہلی' لاہور' اور دوسرے

کئی مشہور شہروں میں چور' ڈاکو' اور لٹیرے دن یا رات کسی بھی وقت آ کر لوٹ مار کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر چوروں و ڈاکوؤں کی جانب سے گورنر کو رشوت دے دی جاتی ہے کہ وہ تماشائی رہے اور انہیں کچھ نہیں کہے ---- حکومت کے عملہ کے لئے دولت کی لالچ اس قدر حاوی ہے کہ وہ اپنی عزت و نام کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے اور ہر حیلے' بہانے' اور ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کر کے اپنے محلات تعمیر کراتے ہیں' ان میں خوبصورت عورتوں کو جمع کرتے ہیں' اس طرح وہ اپنے گھروں کو عیاشی کا ایسا نمونہ بناتے ہیں کہ شاید دنیا بھر میں ان کی مثال نہ ہو۔ اب میں ان امراء کے بارے میں اور ساتھ میں عام غریب لوگوں کے بارے میں بیان کروں گا' کہ ان کی زندگی اس ملک میں کیسی ہے۔

آداب زندگی

جہاں تک لوگوں کے طرزِ رہائش اور اپنے رہنے کے انداز کا سوال ہے تو امیر لوگوں کے پاس تو بے انتہا دولت اور لامحدود طاقت ہے' لیکن اس کے مقابلہ میں عام لوگ انتہائی غربت اور مفلسی کی زندگی گذارتے ہیں۔ مفلسی کے باعث ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے پاس مشکل سے دو وقت کے کھانے کے لئے کچھ ہوتا ہے۔ ان کی رہنے کی جگہوں یا گھروں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ عبرت کا نمونہ ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ لوگ ان تکالیف کو انتہائی صبر کے ساتھ برداشت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اس قابل نہیں کہ ان کے ساتھ اس سے زیادہ اچھا سلوک ہو۔ ان میں مشکل ہی سے کوئی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اپنی زندگی کو تبدیل کرے اور اپنی موجودہ حالت کو بہتر بنائے۔ یہ اس لئے بھی مشکل ہے کہ ذات پات کی وجہ سے لڑکے کو وہی پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے کہ جو اس کے باپ کا ہے۔ لوگوں کے لئے یہ بھی ناممکن ہے کہ اپنی ذات سے باہر شادی بیاہ کر سکیں۔ اس لئے ہر فرد اپنی ذات اور پیشہ کے بارے میں پہلے ہی سے آگاہ ہوتا ہے۔

یہاں پر مزدوروں اور دست کاروں کے لئے دو عذاب ہیں۔ پہلا عذاب تو یہ ہے کہ ان کی تنخواہیں بے انتہا کم ہوتی ہیں۔ سنار' رنگریز' کشیدہ کاری کرنے والے' قالین بننے والے' جولاہے' لوہار' درزی معمار' پتھر توڑنے والے' اور اسی طرح سے دوسرے پیشہ ور دست کار و ہنرمند' یہ اس کام کو جو ہالینڈ میں ایک آدمی کرے چار مل کر کرتے ہیں۔ صبح سے شام تک کام کرنے کے بعد ان کی روزانہ کی کمائی مشکل سے 5 یا 6 ٹکہ ہوتی ہے۔ ایک دوسرا عذاب ان کے لئے گورنر' امراء' دیوان' کوتوال' بخشی

اور دوسرے شاہی عہدے داروں کی شکل میں آتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو کام کروانے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ کام کرنے والے کو' چاہے وہ چاہے یا نہ چاہے' زبردستی پکڑ کر بلوا لیتے ہیں' ایک مزدور یا کاریگر کی یہ ہمت نہیں ہوتی ہے کہ وہ اس پر ذرا بھی اعتراض کرے۔ پورے دن کام کے بعد شام کو یا تو اسے معمولی سی اجرت دی جاتی ہے یا بغیر کسی ادائیگی کے اسے رخصت کر دیا جاتا ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا کھانا کس قسم کا ہو گا۔ وہ گوشت کے ذائقہ سے بہت کم واقف ہوتے ہیں۔ ان کے روز کے کھانے میں سوائے کھچڑی کے اور کچھ نہیں ہوتا ہے جسے چاول اور مونگ کی دال کو ملا کر پکایا جاتا ہے شام کے وقت یہ گھی ملا کر کھاتے ہیں۔ دن کے کھانے میں یہ بھنے ہوئے چنے کھا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے لئے یہ غذا ہی کافی ہے۔

ان کے مکانات کچی مٹی سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ فرنیچر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے سوائے چند مٹی کے برتنوں کے کہ جن میں کھانا پکایا جاتا ہے یا پانی کے مٹکے۔ دو بستر' ایک شوہر کے لئے اور دوسرا بیوی کے لئے۔ یہاں شوہر و بیوی ایک ساتھ نہیں سوتے ہیں۔ شوہر کو جب رات کو ضرورت ہوتی ہے تو وہ بیوی کو اپنے پاس بلا لیتا ہے اور جب وہ فارغ ہو جاتا ہے تو بیوی دوبارہ سے اپنے بستر پر چلی جاتی ہے۔ ان بستروں پر چادریں کم ہی ہوتی ہیں۔ اکثر ایک ہی چادر بچھانے کے کام آتی ہے۔ یہ گرمیوں کے موسم میں تو ٹھیک رہتی ہے' مگر جب سخت سردیاں پڑتی ہیں تو سردی کی راتیں گذارنا ان کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ وہ کمرے کے دروازے کے باہر اپلے جلا کر اسے گرم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ گھر میں کوئی چمنی یا آتشدان نہیں ہوتا ہے اس وجہ سے آگ کے اس دھوئیں سے پورے شہر میں ماحول اس قدر خراب رہتا ہے کہ آنکھیں بہتی رہتی ہیں' اور حلق میں جلن رہتی ہے۔

اس ملک میں چپراسیوں اور ملازموں کی بڑی تعداد ہے۔ ہر شخص کی ملازمت میں ایک یا دو چپراسی ہوتے ہیں چاہے وہ سوار ہو' تاجر ہو' یا شاہی عہدے دار۔ ہر ایک

اپنی حیثیت کے مطابق اپنی خدمت کے لئے ملازم رکھتا ہے۔ گھر کے باہر یہ اپنے آقا کے ساتھ چلتے یا دوڑتے رہتے ہیں' جس کے پاس جتنے زیادہ ملازم ہوں اس سے اس کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ گھر کے اندر یہ گھریلو کام کاج میں مصروف رہتے ہیں کہ جہاں ہر ایک کو خاص ذمہ داری دی جاتی ہے۔ سائس اس کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ بیل والا' اس کے تانگے اور گاڑی کو سنبھالتا ہے۔ فراش' اس کے خیموں اور قالینوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جب وہ سفر پر ہو تو یہ منزل پر خیمہ لگانا اور قالین بچھانے کا کام کرتا ہے۔ جب مالک کا قیام گھر پر ہو تو یہ اس کے دیوان خانہ میں فرش فروش کو دیکھتا ہے۔ مشعلچی رات میں روشنی کا انتظام کرتا ہے ساربان' اونٹوں کی نگرانی کرتا ہے' اس کے ہاتھیوں کے لئے دو یا تین مہادت ہوتے ہیں۔ پیغام رساں' سر پر ٹوپی میں کلغی لگائے' دو گھنٹیوں کو کمر میں باندھے اس کے پیغامات کو لے کر جاتا ہے اور بھاگتا ہوا 25 سے 30 کوس ایک دن میں طے کرتا ہے۔ یہ مستقل افیم یا بھنگ کھاتے ہیں تاکہ انہیں مسلسل دوڑنے کی وجہ سے تھکن کا احساس نہ ہو' اس لئے وہ مدہوشی یا نشہ کے عالم میں دوڑتے رہتے ہیں۔ وہ قاعدے قانون کے مطابق کسی کو اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ وہ کہاں سے آ رہے ہیں؟ اور کہاں جا رہے ہیں؟ بس سیدھے اپنی منزل کی جانب دوڑتے رہتے ہیں۔ یہ اپنے آقاؤں کے لئے کہ جو گورنر جیسا اہم عہدہ رکھتے ہیں' خوش خبری بھی لاتے ہیں' اور بادشاہ کی تنبیہہ یا غصہ بھی۔ بادشاہ کو جو اہم خبریں اور واقعات پہنچائے جاتے ہیں' اگر ان میں دیر ہو جائے اور یہ خبر بادشاہ کو کسی دوسرے ذریعہ سے مل جائے' تو اس عہدے دار کو جس نے یہ خبر بھیجنے میں دیر کی' ذمہ دار سمجھتے ہوئے فوراً اس کے عہدے سے برخاست کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ملازموں کی اس قدر تعداد ہوتی ہے کہ انہیں بعض اوقات گننا مشکل ہو جاتا ہے۔ بڑے امراء کے گھروں میں ہر ملازم اپنی مخصوص ذمہ داری پوری کرتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ کسی پرتگیزی جہاز پر اگر سامنے والا ستون گر جائے تو جہاز کا بڑا عہدے دار اسے فوراً اٹھا کر ٹھیک نہیں کرے گا' بلکہ یہ کام کرنا وہ

اپنی ہتک سمجھے گا اور خاموشی سے وہاں سے گذر جائے گا۔

ملازموں کی تنخواہیں اکثر پیسے کاٹ کر دی جاتی ہیں۔ اکثر بڑے امراء تو 40 دن کو ایک مہینہ گنتے ہیں اور 4 یا 5 روپیہ تنخواہ دیتے ہیں۔ اگر کئی کئی مہینے کی تنخواہیں چڑھ جاتی ہیں تو ان کی ادائیگی پھٹے پرانے کپڑوں یا ٹوٹے برتنوں کی شکل میں کی جاتی ہے۔ اگر ان کا مالک یا آقا کسی اہم عہدے اور منصب پر فائز ہوتا ہے تو اس صورت میں اس کے ملازم بھی بدتمیز اور مغرور ہو جاتے ہیں۔ یہ معصوم لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہیں اور اپنے مالک کی طاقت و اختیارات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی برائیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہیں کہ جو اپنے مالک کی خلوص کے ساتھ خدمت کرتے ہیں۔ جب بھی انہیں موقع ملتا ہے تو اس میں سے اپنا حصہ بطور "دستوری" یا کمیشن کے رکھ لیتے ہیں۔ اگرچہ اس کے بارے میں ان کے مالک کو اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے مگر وہ اس لئے خاموش رہتے ہیں کہ یہ غریبوں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا بوجھ ان کی جیب پر نہیں پڑتا ہے۔ لیکن یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ کمیشن ہمیشہ اس پر دیا جاتا ہے کہ جو وہ خریداری کرتے ہیں اور اس کا بوجھ بہرحال مالک پر ہی پڑتا ہے۔ اگر ملازم یہ سب کچھ نہ کریں تو وہ مشکل سے اپنا اور اپنے خاندان کا گذارہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے ان ملازموں اور مزدوروں کی مالی حالت میں کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے دونوں ہی غربت و مفلسی کی زندگی گذارتے ہیں۔

تاجر' چاہے وہ کسی قسم کی تجارت کرتے ہوں' مصالحہ جات کی یا دواؤں' پھلوں' کپڑوں یا روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی' وہ ایک مزدور کے مقابلہ میں زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو بہت دولت مند اور خوش حال ہیں۔ لیکن ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنی دولت کا اظہار نہ کریں۔ کیونکہ دوسری صورت میں جھوٹے الزامات کے وقت انہیں پکڑ لیا جائے گا اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے اسے قانونی طور پر ضبط کر لیا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گورنر کے اردگرد مخبروں اور جاسوسوں کا ایک مجمع رہتا ہے اور جو اس کی خوشنودی کی خاطر دشمن اور دوست میں

تمیز کئے بغیر لوگوں پر الزامات لگاتے ہیں اور اپنے لئے مراعات حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ دستور بھی ہے کہ اگر بادشاہ کے امراء' یا گورنروں کو ان اشیاء کی ضرورت ہو کہ جو ان کے پاس ہیں۔ تو یہ ان کا فرض ہے کہ انہیں آدھی یا آدھی سے بھی کم قیمت پر فروخت کریں۔ جب بھی امراء اس سے کچھ خریدتے ہیں تو ایک تو اس کی قیمت کم دیتے ہیں۔ پھر ان کے ملازمین اسی میں سے اپنا کمیشن یا دستوری وصول کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب تاجر چند گھنٹوں میں مہینہ بھر کے پورے منافع سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

مختصراً یہ ان تاجر لوگوں کے بارے میں ہے کہ جو اپنی فرماں برداری اور اطاعت میں دوسرے عام لوگوں کی طرح ہیں' اور ان کی بھی وہی حالت ہے کہ جو عوام کی ہے یعنی ذلیل و خوار' گندگی کے کیڑے' اور ان چھوٹی مچھلیوں کی طرح کہ جو چاہے بڑی مچھلیوں سے خود کو کتنا ہی چھپا کر رکھیں' مگر پھر بھی ان کا لقمہ بن جاتی ہیں۔ اب اس کے بعد ہم دولت مند اور امراء کی طرز زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔ لیکن ان کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں اپنے انداز کو مکمل طور پر بدلنا پڑے گا' کیونکہ اب تک ہمارے قلم نے مفلسی و غربت کو اذیت دکھ کے لباس میں پیش کیا تھا' اور یہ چیزیں محبت' دوستی اور خوشی کی دشمن ہیں۔ لیکن جو قلم تنہائی کا دوست ہے وہ غریبوں کے آنسوؤں سے تر ہو جاتا ہے۔ لیکن اب اس قلم کو اپنی روش بدلنی ہو گی اور ان امراء کے بارے میں لکھنا ہو گا کہ جو بڑے بڑے محلات میں معہ اپنی دولت کے رہتے ہیں وہ دولت کہ جو چمک دمک تو رکھتی ہے' مگر یہ دولت غریبوں کے خون پسینے کو بہا کر حاصل کی گئی ہے۔ اس لئے ان کی حیثیت اسی قدر غیر محفوظ اور کمزور ہے کہ جیسے ہوا کہ جو ایک جگہ قرار سے نہیں رہتی ہے' اور جس کی کوئی مستحکم بنیاد نہیں ہوتی ہے۔ ان کی مثال گلاس کے بنے ہوئے کھمبوں کی ہوتی ہے کہ جس سے آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں لیکن جو ذرا سے طوفان کے آگے نہیں ٹھہر سکتے ہیں اور گر کر چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

ان کے محلات کی اندرونی آرائش میں شہوت پرستی' شوخی اور بے ڈھنگے پن کی زیبائش' سطحی قسم کی شان' بے جا غرور' مگر ساتھ میں نفیس قسم کے نقش و نگار نظر آتے ہیں۔ ان کے ملازمین ظالم و جابر' لالچ و طمع سے بھرے' اپنے آقاؤں کی طرح ہر موقع پر لوگوں سے پیسہ اینٹھتے ہیں۔ ایک وقت میں جب کہ یہ امراء سمجھتے ہیں کہ اقتدار کی کرسی پر فائز ہیں اور ان کے مراتب بہت اونچے ہیں' دوسرے ہی وقت میں بادشاہ کی ذرا سی ناراضگی سے یہ ذلت و خواری کی پستی میں گر جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم ایسے ہیں کہ جو اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں۔ وہ جس حال میں ہوتے ہیں' اس کو اپنے تمام ذرائع کے ساتھ خوشگوار بناتے ہیں' اور زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دستور کے تحت یہ تین سے چار بیویاں رکھتے ہیں جو کہ ان کے طبقہ امراء سے تعلق رکھتی ہیں' لیکن ان میں سے پہلی بیوی کو سب سے زیادہ عزت دی جاتی ہے۔ یہ سب مل کر محل میں رہتی ہیں کہ جو چاروں طرف اونچی دیواروں سے گھرا ہوتا ہے' اس کے اندر فوارے' تالاب اور باغات ہوتے ہیں۔ ہر بیوی کے لئے علیحدہ رہائش گاہ ہوتی ہے کہ جہاں وہ اپنی کنیزوں کے ساتھ رہتی ہے۔ ان کنیزوں کی تعداد اس کے رتبہ کے مطابق 20 سے 100 بھی ہو سکتی ہے۔ ہر ایک کو اخراجات کے لئے مہینہ کا خرچہ ملتا ہے۔ زیورات اور ملبوسات انہیں شوہر کی جانب سے ملتے ہیں۔ اور جس کو وہ جتنا پسند کرتا ہے' اسی قدر اس کو تحفے تحائف دیتا ہے۔ کھانا محل کے باورچی خانہ سے آتا ہے' لیکن ہر بیگم کھانا اپنے حصہ میں کھاتی ہے۔ کیونکہ اندر سے وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتی ہیں۔ اگرچہ اس کا اظہار وہ کسی اور کے سامنے بہت کم کرتی ہیں کیونکہ ہر صورت میں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی خوشنودی اور اس کے التفات کو برقرار رکھیں۔ شوہر ان کے لئے ایک انسان سے زیادہ دیوتا ہوتا ہے کہ جس کی وہ عزت بھی کرتی ہیں' پوجا بھی۔ اور اس سے خوف زدہ بھی رہتی ہیں۔ ہر رات وہ کسی ایک بیگم کے ساتھ گذارتا ہے۔ جس کے ہاں وہ رات گذارنے جاتا ہے' وہاں اس کی بیگم کنیزیں اور ملازمائیں اس کا

شاندار استقبال کرتی ہیں۔ یہ اس موقع پر خاص لباس پہنے ہوئے ہوتی ہیں۔ اور اس کے احکامات کی تعمیل میں پھرتی سے ادھر سے ادھر جاتی ہیں۔ اگر موسم گرم ہوتا ہے تو شوہر کے آتے ہی یہ اس کا لباس تبدیل کرا کے اس کے جسم کو صندل اور گلاب کے پانی سے مالش کرتی ہیں۔ ہوا کے لئے مسلسل اس پر پنکھا جھلا جاتا رہتا ہے یا وہ باہر کھلی ہوا میں آکر بیٹھتا ہے۔ ملازم عورتیں کچھ تو مالک کے ہاتھ پیر دبانے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ کچھ اسے گانا سنا کر اس کا دل بہلاتی ہیں کچھ موسیقی کے ساتھ رقص کرتی ہیں' یا کسی اور قسم سے اس کو مشغول رکھتی ہیں۔ اس عرصہ میں اس کی بیوی اس کے قریب بیٹھی رہتی ہے۔

اس کی بیگمات دن رات اس میں مصروف رہتی ہیں کہ کیسے عمدہ اور مسحور کرنے والی خوشبوؤں کو کشید کیا جائے اور کیسے قوت باہ کی ادویات تیار کی جائیں کہ جن میں ہیرے' موتی' سونا' اور افیم کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ شوہر کو اس سے چاہت پیدا ہو۔ وہ خود بھی ایسی تیار شدہ معجونوں کو استعمال کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کے کھانے سے ان کو خوشی و مسرت اور نشاط کا احساس ہوتا ہے۔ رات کی ٹھنڈک میں وہ بڑی مقدار میں شراب پی جاتے ہیں۔ ان کی بیگمات بھی شوہروں کی وجہ سے شراب کی عادی ہو جاتی ہیں۔ اس لئے پچھلے چند سالوں کے اندر اندر شراب نوشی مقبول عام فیشن ہو گئی ہے۔

ایسی مجلسوں میں شوہر اس مرغے کی طرح ہوتا ہے کہ جو مرغیوں میں گھرا بیٹھا ہو۔ یہ محفل آدھی رات تک یا اس وقت جاری رہتی ہے کہ یہ نیند میں مغلوب نہ ہو جائیں۔ اگر سوتے وقت اس کی نظر کسی خوبصورت کنیز پر پڑ جاتی ہے تو وہ اسے اپنے پاس بلا لیتا ہے اور اس کے ساتھ لطف اندوز ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر اس کی بیوی کی ہمت نہیں ہوتی ہے کہ اس پر اعتراض کرے یا اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ اس وقت تو وہ مکاری کرتے ہوئے اپنے پر قابو پا لیتی ہے' مگر بعد میں اس کنیز کے ساتھ وہ اس کا بدلہ لیتی ہے۔

دو' تین' یا ان سے زیادہ خواجہ سرا' جو کہ بنگال سے خریدے جاتے ہیں۔ اور جن کی وفاداری اپنے مالک سے ہوتی ہے' انہیں ہر بیگم کی نگرانی پر رکھا جاتا ہے کہ اس کے کسی اور مرد سے تعلقات قائم نہ ہوں۔ اگر خواجہ سرا اس نگرانی میں ناکام ہو جائے اور کوئی مرد محل میں پایا جائے تو اس کی ذمہ داری اس پر آتی ہے' اس جرم میں اس کو موت کی سزا بھی مل سکتی ہے۔ محل کا مالک ان خواجہ سراؤں کی عزت کرتا ہے' مگر اس سے زیادہ محل کی عورتیں ان کا خیال رکھتی ہیں۔ کیونکہ محل کے تمام انتظامات ان ہی کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ اور یہ ان کا اختیار ہوتا ہے کہ جس چیز کو چاہیں منظور کر لیں' اور جو چاہیں انکار کر دیں۔ اس لئے ان لوگوں کو ہر وہ چیز ملتی ہے جس کی یہ خواہش کرتے ہیں : سواری کے لئے عمدہ گھوڑے' خدمت کے لئے ملازم' محل میں دیکھ بھال کے کے لئے کنیزیں' اور اتنے ہی بیش قیمت کپڑے جیسے کہ ان کے مالک کے ہوتے ہیں۔ بیگمات ان لوگوں کو خوش رکھنے کے لئے ہر طرح سے تیار رہتی ہیں۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی ہیں کہ ان کے بارے میں ہر بات ان کے شوہر کو معلوم ہو۔ ان میں سے کچھ' یا شاید اکثر' اس وقت جب کہ ان کا شوہر دربار میں ہوتا ہے یا شہر سے باہر اپنی کسی پسندیدہ بیوی کے ہمراہ چلا جاتا ہے اور گھر کی تمام ذمہ داریاں ان خواجہ سراؤں پر چھوڑ جاتا ہے تو اس وقت بیگمات ان خواجہ سراؤں کو یہ موقع دیتی ہیں کہ ان میں جس قدر اہلیت ہے اس کے حساب سے وہ اپنے جذبات کو ٹھنڈا کریں کیونکہ ان لوگوں کو اپنی تسکین کے لئے اس سے اچھا اور کوئی موقع نہیں ملتا ہے۔ یہ مظلوم عورتیں اگرچہ قیمتی لباس پہنتی ہیں' بہت خوش ذائقہ کھانا کھاتی ہیں' اور سوائے ایک کے دنیا کی ہر خوشی سے لطف اندوز ہوتی ہیں' لیکن اس ایک خوشی کے لئے وہ افسردہ رہتی ہیں' اور کہتی ہیں کہ اس خوشی کے لئے وہ ہر تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہیں یہاں تک کہ ایک فقیر کی طرح غربت و مفلسی بھی۔

ہمارے ملک کی خواتین کو یہ پڑھ کر احساس ہونا چاہئے کہ وہ اپنی پیدائش کے لحاظ سے کس قدر خوش قسمت ہیں۔ اور آزادی کے لحاظ سے دوسرے ملکوں کی

خواتین کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ موضوع میرے لحاظ سے ایک دوسرا ہی ہے' لہٰذا اب میں ان مکانات کے بارے میں بتانا چاہوں گا کہ جو یہاں تعمیر ہوتے ہیں۔

یہ مکانات اعلیٰ اور دلکش ہوتے ہیں' ان میں کئی حصے ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں دوسری منزل نہیں ہوتی ہے بلکہ سپاٹ و ہموار چھت ہوتی ہے کہ جہاں یہ شام کی ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ عام طور سے مکانوں کے اندر حوض اور باغات ہوتے ہیں۔ گرمیوں میں روز تازہ پانی سے ان حوضوں کو بھرا جاتا ہے یہ تازہ پانی کنوؤں سے بیلوں کی مدد سے نکالا جاتا ہے۔ یہاں گرمیوں کے موسم میں تازہ پانی اور سبز و شاداب درخت ایک ایسی تازگی بخشتے ہیں کہ جس سے ہم سرد ملکوں والے ناواقف ہیں۔ یہ مکانات چند سالوں تک رہتے ہیں کیونکہ ان کی دیواریں مٹی سے بنائی ہوتی ہیں اور پکی نہیں ہوتی ہیں۔ ان دیواروں پر سفیدی ہر طرف خاص طور سے نظر آتی ہے اور یہ ہمارے ملکوں سے زیادہ اچھی طرح کی جاتی ہے سفیدی کا یہ مواد چونے' گوند' اور شکر کو ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس مواد کو یہ دیوار پر اس وقت تک ملتے ہیں کہ جب تک وہ چکنی نہیں ہو جائے۔ پھر وہ قیمتی پتھر (عقیق یمنی) سے آہستہ آہستہ اسے رگڑتے ہیں۔ یہاں تک یہ سخت اور خشک ہو جاتا ہے اور سنگ مرمر کی طرح سے چمکنے لگتا ہے یہ اس قدر شفاف ہو جاتا ہے کہ اس میں اپنا چہرہ دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کے ہاں ہماری طرح کا فرنیچر نہیں ہوتا ہے جیسے کہ میز' کرسی' کپ بورڈ یا بستر وغیرہ لیکن ان کی چارپائیاں اور دوسرا استعمال کا فرنیچر ایسا ہے کہ جس سے ہم ناواقف ہیں۔ اس فرنیچر کو فیاضانہ طور پر سونے و چاندی سے منقش کیا جاتا ہے۔ وہ کھانے پینے کے برتن بھی سونے یا چاندی کے استعمال کرتے ہیں۔ محل کے باہر دیوان خانہ ہوتا ہے جہاں کے منقش قالین جو بہت صاف ستھرے اور سلیقہ سے بچھے ہوتے ہیں۔ یہاں پر صاحب خانہ صبح کے وقت اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے جلوہ افروز ہوتا ہے اور اس کا تمام ماتحت عملہ اسے سلام کے لئے آتا ہے۔ اس قسم کے آداب

کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کرنے والا شخص جھکتا ہے اور سیدھے ہاتھ کو ماتھے پر رکھ کر آداب بجا لاتا ہے۔ لیکن جو صاحب مرتبہ ہوتے ہیں وہ صرف تھوڑا سا جھکتے ہیں' اگر کوئی اجنبی اس محفل میں آئے تو پہلے اس کے نام کا اعلان کیا جاتا ہے پھر اس کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

سلام و آداب کے بعد آنے والے اپنے عہدے و مرتبہ کے لحاظ سے صاحب خانہ کے دائیں و بائیں اپنی نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ پورا مجمع اس قدر خاموش اور سنجیدہ ہوتا ہے کہ ان کی موجودگی سے احساس ہوتا ہے کہ یہ دانشمندوں اور فلسفیوں کا مجمع ہے۔ کوئی شخص اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت نہیں کرتا ہے چاہے اس حالت میں وہ صبح سے شام تک بیٹھا رہے۔ ان کے بولنے میں بھی بڑی سنجیدگی و متانت ہوتی ہے۔ وہ زور سے نہیں بولتے ہیں نہ ہی کسی قسم کا شور کرتے ہیں' اور نہ ہی حرکات و اشارے کرتے ہیں۔ اگر انہیں کوئی راز کی بات کہنی ہوتی ہے تو وہ نہیں چاہتے کہ یہ ہر ایک سنے' اس لئے وہ اپنے منہ پر رومال یا پٹکا رکھتے ہیں۔ اور قریب جا کر بولتے ہیں تاکہ سننے والا اور سنانے والا ایک دوسرے کی سانس کی بو سے متاثر نہ ہو۔ جیسے ہی کسی شخص کو اس کے سوال کا جواب ملتا ہے وہ فوراً اپنی نشست چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لیکن دوست' واقف کار اور اعلیٰ مرتبت لوگ اس وقت تک رہتے ہیں۔ جب تک کہ صاحب خانہ گھر میں جانے کے لئے تیار ہو جائے یا کہ کھانے کا وقت آ جائے۔ یہاں پر کھانے کے کوئی خاص اوقات مقرر نہیں ہیں۔ کھانے سے پہلے یہ لوگ ہاتھ دھوتے ہیں۔ اس کے بعد دستر خوان بچھایا جاتا ہے۔ کھانے میں مختلف قسم کے پلاؤ' دو پیازہ' بھنا ہوا گوشت اور دوسری چیزیں ہوتی ہیں۔ کھانا بڑی قابوں میں آتا ہے۔ گھی کا استعمال بہت کم کیا جاتا ہے' لیکن ہمارے ذائقہ کے مطابق بہت زیادہ مصالحے ہوتے ہیں۔ سفراچی یا داروغہ مطبخ دستر خوان کے بیچ میں بیٹھتا ہے' اور ہر مہمان کے سامنے کھانا پیش کرتا ہے۔ پہلے کھانا اہم اور بزرگ عہدے داروں اور اعلیٰ مرتبہ کے لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ کھانے میں یہ لوگ چمچے یا چھریوں کا استعمال بالکل

نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ انگلیوں کی مدد سے کھاتے ہیں۔ کھاتے وقت انگلیاں پوروں تک سالن سے بھر جاتی ہیں۔ نیپکن استعمال کرنے کا رواج نہیں ہے۔ مگر انگلیاں چاٹنے کو برا سمجھا جاتا ہے۔ ہر شخص اس کھانے پر توجہ دیتا ہے کہ جو اس کے سامنے ہوتا ہے۔ بائیں ہاتھ سے کھانے کو نہیں چھوا جاتا ہے۔ اور نہ ہی کھانے کے دوران پانی یا شراب پی جاتی ہے۔ جب کھانا ختم کر چکتے ہیں اور دعا مانگنے کے بعد ہاتھ دھو لیتے ہیں اس وقت کچھ پیتے ہیں۔ دوپہر یا شام کے کھانے کے بعد رخصت ہوتے ہوئے مہمان صرف یہ کہہ کر رخصت ہو جاتے ہیں کہ صاحب خانہ پر خدا کی رحمت ہو۔ اس کے بعد صاحب خانہ محل میں قیلولہ کی غرض سے چلا جاتا ہے جہاں وہ شام تک آرام کرتا ہے' اور پھر دوبارہ سے دیوان خانہ میں آتا ہے۔ لیکن تمام امراء کا یہ طریقہ نہیں ہے بہت سے دولت مند حضرات جو کہ بچت پر یقین رکھتے ہیں وہ محل کے اندر کھانا کھاتے ہیں تاکہ باہر کھانے کے اخراجات سے بچا جا سکے۔ جب وہ بادشاہ کے ساتھ اس کے کمپ میں ہوتے ہیں تو اس وقت وہ اپنا دربار منعقد نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ اس وقت وہ صبح سے شام تک مسلسل ڈیوٹی پر ہوتے ہیں کچھ امراء ایسے ہیں کہ جن کی بیگمات باعفت رہتی ہیں' مگر ان کی تعداد بہت کم ہے اکثر بیگمات خود پر قابو نہیں رکھتی ہیں' اور جب ان کے شوہر باہر ہوتے ہیں۔ یا سفر پر چلے جاتے ہیں' تو خواجہ سراؤں کی نگرانی اور احتیاط کے باوجود وہ کوشش کرتی ہیں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور جس قدر تسکین حاصل کر سکتی ہیں وہ کریں' اگرچہ پھر بھی اپنی خواہش کے مطابق اپنی آرزوں کو پورا نہیں کر سکتی ہیں۔

مذہبی توہمات

مسلمانوں کے مذہب کے بارے میں ہماری زبان میں کافی مواد چھپ چکا ہے۔ لیکن اب تک ان کے توہمات کے بارے میں کہ جو اس ملک میں عام ہیں' نہیں لکھا گیا ہے لہٰذا میں ان میں سے کچھ کے بارے میں یہاں لکھوں گا' ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں کہ جو کیتھولک فرقہ والوں کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ان کے ہاں بھی اسی قدر پیر' فقیر ہیں کہ جیسے کیتھولک فرقہ والوں کے ہاں بزرگ اور اولیاء ہیں۔ لیکن یہ لوگ ان کی مورتیاں نہیں بناتے ہیں کیونکہ یہ ان کے مذہب میں ممنوع ہے۔ لیکن یہ بھی ان کی طرح منتیں مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جیسے ہر دنیاوی بادشاہ کا اپنا دربار ہوتا ہے۔ اس کے امراء اور عہدے دار ہوتے ہیں کہ جو اپنے اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہیں۔ اور انتظام سلطنت کی دیکھ بھال کرتے ہیں' جیسے بادشاہ تک کوئی بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کی رسائی کسی امیر یا عہدے دار سے نہ ہو۔ اسی طرح سے خدا تک سفارش پہنچانے کے لئے بھی اس کے کسی نمائندے کی ضرورت ہے کہ جو اس کی درخوات کو منظور کرائے۔ یہ لوگ بھی کیتھولک فرقہ کی طرح اس گمراہی میں ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ خدا عالم الغیب اور ہر چیز کا جاننے والا ہے لیکن یہ لوگ اس سے آنکھیں بند کر کے' اور خدا کی رحمت سے انکار کر کے' ان جھوٹے لوگوں کے دام فریب میں آ جاتے ہیں۔ ان نام نہاد اولیاء کا سحر اور جادو غریب لوگوں پر نہ صرف ان کی زندگی میں بھی چتا ہے بلکہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے مرید اور چالاک متولی غریب لوگوں کو مسلسل فریب و دھوکے میں مبتلا رکھتے ہیں۔ ان کو پتہ ہوتا ہے کہ عام لوگوں کو کس طرح سے قابو میں

رکھا جائے اس مقصد کے لئے یہ عوام میں ان کی کراماتیں اور عجیب و غریب واقعات کے بارے میں کہانیاں پھیلاتے ہیں کہ جنہیں سن کر لوگ ان کے عقیدت مند ہو جاتے ہیں۔

یہاں کے ایک مشہور پیر معین الدین اجمیری ہیں کہ جو ایک خوبصورت اور قیمتی مقبرے میں دفن ہیں۔ ان کے مقبرے کی زیارت کے لئے لوگ دور دور سے یہاں آتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جن کی کوئی اولاد نہیں ہے وہ زیارت کے لئے پیدل آتے ہیں۔ بادشاہ اکبر بھی کہ جس کی نوجوانی میں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے منت مانی تھی اور اپنی بیگم مریم زمانی کے ہمراہ ان کے مزار پر پیدل چل کر گیا تھا یہ سفر اس نے آگرہ سے کیا تھا اور روز 4 کوس کا فاصلہ طے کرتا تھا' اس کی یادگار کے طور پر اس نے ہر کوس پر ایک مینار تعمیر کر دیا تھا' اور اس کے ساتھ ایک کنواں کھدوا دیا تھا تاکہ مسافروں کو تکلیف نہ ہو۔ اسی طرح ہر 8 کوس کے فاصلے پر عورتوں کے لئے محل بنوایا تھا۔ ہوا یہ کہ اس کے بعد اس کی بیوی حاملہ ہو گئی جس سے موجودہ بادشاہ جہانگیر پیدا ہوا۔ اس کے بعد سے لوگوں کا اعتقاد اور پختہ ہو گیا کہ پیر کی دعا سے اولاد پیدا ہوتی ہے' اور جہانگیر انہیں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے (جہاں گیر سلیم چشتی کی دعا کے نتیجہ میں پیدا ہوا) اس قسم کے دوسرے پیروں کی تعداد یہاں پر بہت ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی کراماتوں اور خاص خواہشات کو پورا کرنے کے لئے مشہور ہے۔

آگرہ سے 70 کوس کے فاصلہ پر شاہ مدار کا مزار ہے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بڑے کراماتی اور صاحب حال بزرگ تھے۔ فروری کے مہینہ میں ان کے عرس کے موقع پر ان کے عقیدت مند دور دراز کے علاقوں سے آ کر سکندرہ میں جمع ہوتے ہیں اور پھر یہاں سے ایک فوج کی شکل میں ان کے مقبرے کی طرف مارچ کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں مریدوں سے زیادہ تعداد قلندروں کی ہوتی ہے جو کہ اپنے اپنے گروہوں کو اپنے جھنڈوں تلے لے کر وہاں جاتے ہیں۔

یہاں پر اسی قسم کے اور بہت سے تہوار ہوتے ہیں' مگر ان سب کو بیان کرنے

سے کنفیوژن پیدا ہو گا اس لئے میں صرف چند کا بیان کرتا ہوں۔ میں خاص طور سے ان مقدس لوگوں کا بیان ضرور کروں گا کہ جن سے میری ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک سلطان خسرو' بادشاہ کا بڑا لڑکا ہے۔ فروری 1621ء میں اسے اس کے چھوٹے بھائی شہزادہ خرم کے حکم سے برہانپور میں قتل کر دیا گیا تھا کیونکہ اس کے بارے میں خیال یہ تھا کہ وہ موجودہ بادشاہ کا جانشین ہو گا۔ اس کو قتل کرنے والا ایک غلام تھا کہ جس کا نام رضا تھا کہ جس نے رات میں لنگی سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اس طرح سے مارنے کا مطلب یہ تھا کہ کسی کو قتل کا شبہ نہ ہو اور یہ سمجھا جائے کہ شہزادہ فطری موت مرا ہے۔ اس کی لاش کو آگرہ لایا گیا اور یہاں سے الہ آباد لے جایا گیا تاکہ وہاں اس کی ماں کے قریب دفن کیا جائے۔ اس کی موت پر لوگوں نے دلسوز انداز میں اپنے غم کا اظہار کیا کیونکہ وہ عام لوگوں میں بڑا مقبول تھا۔ لہٰذا کچھ قلندروں نے ہر اس منزل پر کہ جہاں سے اس کا تابوت گذرا تھا وہاں ایک قبر بنا دی اور لوگوں سے کہا کہ خدا نے انہیں یہ بشارت دی تھی کہ وہ شہزادے کی یاد میں یہ قبریں بنائیں' کیونکہ وہ بے گناہ اور معصوم تھا اور اس کا قتل خون ناحق ہے۔ لہٰذا لوگوں کو چاہیے کہ وہ ہر جمعرات کو ان قبروں پر آئیں اور نذر نیاز دیں' ان کی منتیں اور دعائیں بارگاہ حقیقی میں ضرور قبول ہوں گی کیونکہ خسرو کا جنت میں بھی وہی مقام ہے کہ جو اس دنیا میں تھا۔ اس اپیل کا لوگوں پر اس قدر اثر ہوا کہ برہانپور' سرونج' آگرہ' اور الہ آباد میں ہندو اور مسلمان دونوں بڑی بڑی جماعتوں میں مزار پر معہ جھنڈوں اور بینڈ باجوں کے جانے لگے اور جلد ہی اسے لوگوں نے ولی بنا لیا لوگ اس حد تک گئے کہ اس کے نام پر قسمیں کھانے لگے اور عہد کرنے لگے یعنی "سلطان کے سر کی قسم" یہ عہد اس قدر پکا ہوتا ہے کہ شاید وہ خدا کے نام پر بھی ایسا نہ کریں۔ اس کے والد' یعنی موجودہ بادشاہ نے اس رسم کو ختم کرنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ خسرو اپنی زندگی میں ایک گناہ گار اور باغی شہزادہ تھا۔ اگر واقعی اسے قتل کیا گیا ہے تو اس کا ذمہ دار قاتل ہے لیکن محض اس وجہ سے خسرو کو ولی یا پہنچا ہوا بزرگ بنانا صحیح نہیں ہے۔ بادشاہ کے

حکم پر آگرہ کے گورنر قاسم خاں نے ان تمام مزاروں کو ڈھا دیا اور وہاں کے تمام خدام کو بھگا کر ان کے نذرانوں پر قبضہ کر لیا' وہاں جو کچھ ملا وہ سب بادشاہ کے نام پر ضبطی میں آیا۔

اس کی وجہ سے تین قسم کے لوگ متاثر ہوئے: ایک وہ فقیر جو کہ ہر جمعرات کو ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے اور ان کو خیرات یا بھیک دیئے بغیر کوئی شاہراہ سے گذر نہیں سکتا تھا۔ ان کا بھیک مانگنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مسلسل یہ نعرہ لگاتے رہتے تھے کہ "سلطان کا سر" اور اسی سے وہ اتنا کچھ حاصل کر لیتے تھے کہ اس سے ایک ہفتہ کے گذارے کا بندوبست ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد مٹھا بیچنے والے تھے کہ جو سڑک کے دونوں جانب مٹھائی کے اسٹال لگا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور آنے والوں کو یہ مٹھائی فروخت کر کے منافع کماتے تھے' پھر کھلونے بیچنے والے ہوتے تھے' کیونکہ اکثر لوگ واپسی پر بچوں کے لئے کھلونے لے کر جاتے تھے۔ جو میدان اور خالی جگہیں تھیں وہ کرتب دکھانے والوں' ناچنے والوں' اور مختلف قسم کے تماشہ کرنے والوں سے بھری ہوتی تھیں۔ یہاں اس قدر شوروغل ہوتا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی' اس طرح مجمع اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ اس میں چلنا یا حرکت کرنا مشکل تھا۔ آخر میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والی پردے میں رہنے والی عورتیں تھیں۔ زیارت کے بہانہ وہ یہاں تفریح کی غرض سے آتی تھیں۔ اور شاید ان میں سے کچھ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے محبوبوں سے بھی ملتی ہوں کیونکہ اس قسم کی ملاقاتوں کے لئے باغات میں وقت مقرر کیا جاتا ہے جو کہ یہاں پر بڑی تعداد میں ہیں' باغات کی تنہائی میں دو چاہنے والے ملتے ہیں اور راز و نیاز کی باتوں سے تسکین حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ ان میں اکثریت ان عورتوں کی ہوتی ہے کہ جنہیں اس دن کے علاوہ باہر آنے کا اور کوئی موقع نہیں ملتا ہے۔ ان ہی موقعوں پر عورتیں کسی خوبصورت نوجوان کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں' مگر ہوتا یہ ہے کہ عورت تو اپنے محبوب کو دیکھ سکتی ہے' مگر وہ اس عورت کے دیدار سے محروم رہتا ہے۔ اس لئے پابندی کا سب سے

زیادہ افسوس اس مظلوم مخلوق کو ہوا ہے کہ جنہیں تھوڑی تازہ ہوا اور تفریح میسر آ جاتی تھی' آگرہ کے علاوہ کہ جہاں اس پر پابندی لگ گئی ہے برہانپور' سرونج' اور دوسرے شہروں میں یہ چہل پہل اور زیارت جاری ہے۔

دیکھا جائے تو ان کے تمام اولیاء کی ابتداء اسی طرح سے ہوتی ہے اور یہ تمام لوگ اپنے زمانے میں جادو ٹونے میں لگے رہتے تھے۔ مسلمان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اسلام کے بعد عیسائیت و یہودیت کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے کیونکہ یہ مذاہب وقت کے ساتھ مسخ ہو گئے ہیں۔ وہ پیغمبر محمد صلی اللہ علہ و سلم کے بارے میں ایمان رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول تھے' انہوں نے کئی معجزے دکھائے' جب وہ چلتے تھے تو سورج کی روشنی سے بچاؤ کے لئے ان پر بادل سایہ کیا رہتا تھا' ان کا اپنا کوئی سایہ نہیں ہوتا تھا' ان پر کوئی مکھی آ کر نہیں بیٹھتی تھی۔ ان کے لئے طویل راستے مختصر ہو جاتے تھے اور شاہراہیں سکڑ کر کم ہو جاتی تھیں۔ اب میں اس کے بعد ان کے تہواروں کے بارے میں ذکر کرتا ہوں۔

ان کے دو بڑے تہوار ہوتے ہیں کہ جو عید کہلاتے ہیں۔ ان کی تاریخوں کا تعلق چاند کے نظر آنے پر ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ اگست میں آیا تھا' مگر اس مرتبہ یہ جون میں ہے۔ اس پورے مہینہ میں لوگ پابندی سے روزے رکھتے ہیں اور پورے دن میں نہ تو کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں یہاں تک کہ شام کے اندھیرے میں تاروں کی روشنی نظر آنے لگے۔ اس گرمی کے موسم خاص طور سے پانی سے پرہیز بڑا مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ رات کو بہرحال یہ مچھلی' گوشت اور ہر چیز کھا سکتے ہیں۔ اس پورے مہینہ میں وہ اپنی بیویوں سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ اور دنوں میں تو وہ شراب کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں' جو ان کے مذہب میں ممنوع ہے مگر وہ اس کا جواز ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ رمضان کے دنوں میں بہرحال وہ اس سے پرہیز کرتے ہیں۔

اس مہینہ کے ختم ہونے پر عید کا تہوار آتا ہے' اس کو وہ اسی عقیدت سے

مناتے ہیں کہ جیسے ہم ایسٹر کے تہوار کو۔ صبح کی نماز کے لئے وہ عید گاہ جاتے ہیں۔ جو کہ عموماً شہر سے باہر ہوتی ہے۔ یہاں قاضی کی امامت میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ نماز کے لئے تمام طبقوں کے لوگ جمع ہوتے ہیں' اور اس کے بعد سب خوشی و مسرت کے ساتھ واپس اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ امراء شان و شوکت اور دھوم دھام کے ساتھ' غریب لوگ صاف و دھلے کپڑے پہنے ہوئے۔ اس موقع پر دوست ایک دوسرے کے ہاں اچھے شگون کے طور پر کھانے بھیجتے ہیں۔ ہر ایک اس لئے خوش ہوتا ہے کیونکہ روزوں کا بوجھ اور ہر قسم کا پرہیز ختم ہو چکا ہوتا ہے۔

دوسری عید 70 دن کے بعد آتی ہے۔ اس وقفہ میں بہت کم شادیاں ہوتی ہیں۔ یہ تہوار حضرت ابراہیمؑ کے اس نیک عمل کی یاد میں منایا جاتا ہے کہ جب وہ خدا کے حکم سے اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ (مسلمان حضرت اسماعیلؑ کو مانتے ہیں) قربان کرنے والے تھے' مگر خاص وقت پر خدا تعالیٰ نے ان کی نیک نیتی کو دیکھتے ہوئے حضرت اسحاقؑ کی جگہ ایک بکرے کو رکھ دیا۔ اس لئے اس دن جو بھی مالی لحاظ سے اس قابل ہوتا ہے وہ بکرے کی قربانی کرتا ہے اور اس دن کو خوشی و مسرت کے ساتھ مناتا ہے۔ ایک مہینہ کے بعد محرم کا مہینہ آتا ہے جو کہ حضرت حسنؓ و حسینؓ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ ان کے ماننے والے خود کو شیعہ کہتے ہیں جب کہ دوسرا فرقہ سنی کہلاتا ہے۔ محرم کے دوران شیعہ فرقہ کے لوگ ماتم کرتے ہیں۔ ان دنوں میں مرد اپنی عورتوں سے دور رہتے ہیں اور دن میں روزہ رکھتے ہیں۔ عورتیں مرثیے پڑھتی ہیں۔ اور اپنے غم کا اظہار کرتی ہیں۔ ماتم کے اس اظہار کے لئے تعزیہ بنائے جاتے ہیں کہ جنہیں خوب سجا کر شہر کی سڑکوں پر گھمایا جاتا ہے اور جلوس کے وقت کافی شوروغل ہوتا ہے آخری تقریب یوم عاشورہ پر شام میں ہوتی ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خدا نے پورے ملک کو غم و اندوہ میں ڈبو دیا ہے بالکل اسی طرح جیسے فرعون نے جب حکم دیا تھا کہ ایک دن میں تمام پیدا ہونے والے بچے قتل کر دیئے جائیں۔

شام کو جب جلوس کے بعد تعزیوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے دریا میں لایا جاتا ہے

اس وقت اگر دو جلوسوں کا آمنا سامنا ہو جائے تو ان میں سے کوئی کسی ایک کو راستہ دینے پر تیار نہیں ہوتا ہے' اور ذرا سی بات پر دونوں جماعتیں تلواریں نکال کر ایک دوسرے کے قتل پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اس موقع پر صبح کے وقت کسی ہندو کو یہ ہمت نہیں ہوتی ہے کہ وہ سڑک پر آئے۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ موت سے تو بچ جاتے ہیں مگر اپنا بازو یا ٹانگ ضرور تڑوا لیتے ہیں۔ تعزیوں کو ٹھنڈا کرنے کے بعد وہ گھروں کو واپس جاتے ہیں' پھر لباس تبدیل کر کے اپنے رشتہ داروں کی قبروں پر فاتحہ کے لئے جاتے ہیں۔ اس موقع پر قبروں پر سفیدی کی جاتی ہے اور ان پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ فاتحہ کے بعد ضرورت مندوں اور محتاجوں کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اس دن مرنے والوں کے نام پر جو بھی صدقات دیئے جائیں گے اور غریبوں کو کھانا کھلایا جائے گا اس کا ثواب ان کو دوسری دنیا میں ملے گا چاہے وہ جنت میں ہوں یا دوزخ میں۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہے کہ جیسے کیتھولک فرقہ کے لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر مرنے والوں کے نام پر دعائیں پڑھی جائیں' تو ان کی برکت سے وہ عالم برزخ سے یا تو جنت میں چلے جائیں گے' یا وہیں انہیں کچھ گناہوں کی معافی مل جائے گی۔

ہندومت

میری خواہش تو یہ تھی کہ میں ہندومت' اور اس کے اعتقادات پر تفصیل سے لکھوں' لیکن جب میں نے اس کا مطالعہ کیا اور اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں تو مجھے پتہ چلا کہ چند دلکش اور شاعرانہ قصے کہانیوں' ہزاروں دیوی و دیوتاؤں اور ان کے کرداروں اور ان کے عقیدوں کی بوقلمونی کے سوا اس میں اور کچھ نہیں۔ بس اس بات نے مجھے تفصیل میں جانے سے روک دیا اور میں نے سچائی کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہندومت میں اگر ایک فرقہ کوئی بات کہتا ہے تو دوسرا فرقہ اس سے الگ ہٹ کر بالکل دوسری بات بتاتا ہے۔ اگر اس مذہب کے بارے میں مصنّفین کی تحریریں پڑھو تو اس میں تضادات ہی تضادات نظر آئیں گے کیونکہ اپنا مواد شاید انہوں نے کئی فرقوں سے لیا ہو گا۔

مثلاً گجرات کے بنیوں کی لاتعداد ذاتیں ہیں اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ نہ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں۔ برہمنوں کی ذات چونکہ قابل عزت ہے اس لئے صرف اس کے ساتھ کھانے پینے میں ممانعت نہیں ہے۔ اسی طرح یہاں پر کھتریوں میں کئی ذاتیں ہیں۔ لیکن یہ لوگ پھر بھی اپنے اعتقادات میں اس قدر تنگ نظر نہیں ہیں۔ یہ بھیڑ و بکری کا گوشت کھا لیتے ہیں۔ اور اپنی نجی محفلوں میں شراب سے بھی شوق کر لیتے ہیں۔ لیکن ایسی ذاتوں سے بھی میری واقفیت رہی ہے وہ کسی ایسی چیز کو نہیں کھاتے کہ جس میں زندگی ہو' یہاں تک کہ کچھ سبزیاں بھی۔ ان کی غذا محض چاول' اناج' اور گھی ہوتی ہے۔ یہاں پر یہ عام بات ہے کہ جتنے خاندان ہیں' اسی قدر عقیدے ہیں۔ چونکہ شادی بیاہ صرف ذات میں ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی ذات و

برادری ختم ہو جائے تو اس کے ساتھ اس کا عقیدہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

انہی رسومات و تہواروں کے معاملات میں ہندو مسلمانوں سے زیادہ سخت ہیں کوئی ہندو عورت و مرد چاہے کس قدر سردی ہو' ضرور صبح کے وقت نہاتا ہے عام لوگ تو دریا یا ندی کے کنارے جا کر نہاتے ہیں' جب کہ امراء گھروں پر نہاتے ہیں وہ اس وقت تک کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے جب کہ نہا نہ لیں۔ جب وہ کھاتے ہیں تو اس وقت ان کا سر کھلا ہوتا ہے' جس رسوئی میں کھانا ہوتا ہے وہ اس وقت تک کسی کو جانے کی اجازت نہیں کہ جب تک وہ کھانے میں مصروف ہیں۔ اگر کوئی آ جاتا ہے تو وہ کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ سال میں ایک بار گنگا میں جا کر ضرور نہائیں۔ جو اس قابل ہوتے ہیں وہ 500 سے 600 کوس کا فاصلہ اس مقصد کے حصول کے لئے طے کرتے ہیں۔ وہ اکتوبر کے مہینہ میں غسل کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس کے بعد ان کے تمام گناہ دھل جاتے ہیں' واپسی پر وہ گنگا کا پانی اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ اور اسے برکت کے لئے گھر میں رکھتے ہیں' ان کا خیال ہے کہ اس پانی کی وجہ سے وہ جادو ٹونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس پانی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ نہ تو اس میں بدبو ہوتی ہے اور نہ اس میں کیڑے پیدا ہوتے ہیں چاہے اسے 400 سال تک رکھا جائے۔ اس وجہ سے وہ اس دریا کو مقدس سمجھتے ہیں۔ غسل کرنے کی یہ جگہیں آگرہ سے 40 کوس کے فاصلے پر ہیں۔

کچھ برہمن بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ وہ اچھے نجومی' کی طرح ستاروں کی حرکات سے واقف اور موسموں و حالات کے بارے میں پیشین گوئی کرتے ہیں۔ وہ چاند اور سورج گرہن کے بارے میں بالکل صحیح اندازہ کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ قسمت کا حال بھی بتاتے ہیں۔ ہر شہر میں اس شہرت کے دو یا چار برہمن ضرور ہوتے ہیں۔ موجودہ بادشاہ بھی خاص طور سے ایک کو اپنے دربار میں رکھتا ہے۔ ان کی پیشین گوئیاں اکثر صحیح ثابت ہوتی ہیں۔ ان برہمنوں کا اثر بادشاہ اور امراء پر اس قدر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس وقت تک سفر پر روانہ نہیں ہوتا ہے کہ جب تک یہ

مناسب دن اور مبارک وقت کے بارے میں نہ بتائیں۔ یہ اس وقت تک واپس نہیں آتے ہیں' اور نہ ہی شہر میں داخل ہوتے ہیں کہ جب تک نیک ساعت کا تقرر نہ ہو جائے۔ اکثر یہ اس ساعت کے لئے شہر کے باہر انتظار کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ شہر کی گلیوں میں برہمنوں کو ہاتھ میں کتابیں لئے دیکھیں گے کہ جو لوگوں کو ان کی قسمت کا حال بتاتے ہیں۔ ان کی چالاکی یہ ہے کہ یہ اپنی پیشین گوئی اس طرح مبہم الفاظ میں کرتے ہیں کہ جس کا کوئی بھی مطلب لیا جا سکتا ہے۔

ہندو' کہ جن کا ذکر میں نے کیا ہے' ان کے روزگار کے تین طریقے ہیں: پہلے بڑے تاجر اور جوہری ہیں۔ یہ اپنے کاروبار اور تجارت میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کام کرنے والے مزدور یا کاریگر آتے ہیں۔ یہ تقریباً سب ہندو ہوتے ہیں۔ مسلمان بہت کم دست کاری و کاریگری میں ہیں' سوائے جولاہوں اور رنگریزوں کے۔ ان دو پیشوں میں ہندو کم اور مسلمان زیادہ ہیں۔ تیسرے طبقے میں منشی اور دلال آتے ہیں۔ تمام امراء کے محلات و جائداد اور بڑے تاجروں کا حساب کتاب یہی لوگ کرتے ہیں۔ یہ بڑے چالاک دلال ہوتے ہیں اس لئے انہیں ہر جگہ یہ کام دیا جاتا ہے' گھوڑوں' بیلوں' اونٹوں' اور ہاتھیوں کی تجارت میں ان کو دخل نہیں یہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔

ہندوؤں کی ایک قسم راجپوت کہلاتی ہے۔ یہ لوگ پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں اور بڑے عمدہ فوجی ہوتے ہیں۔ ان میں کئی قبیلوں کو موجودہ بادشاہ اور اس کے باپ نے مفتوح کر لیا ہے۔ ان کی کمزوری کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے علاقے میں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ہیں کہ جن کے راجہ اور سردار باہم لڑتے رہتے ہیں' اس وجہ سے ان کی متحد طاقت نہیں ہے۔ ہر راجہ کے پاس صرف ایک قلعہ اور شہر ہوتا ہے کہ جہاں سے وہ اپنے علاقے کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ بہادر و شجاع لوگ ہوتے ہیں۔ اور وفاداری میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اگرچہ شکل و صورت میں چھوٹے قد کے اور بدصورت ہوتے ہیں۔ گھوڑے کی سواری کے وقت یا پیدل ان کے پاس چھوٹا نیزہ'

ڈھال' تلوار' اور خنجر ہوتا ہے۔ وہ مشکل سے میدان جنگ سے بھاگتے ہیں اور حملہ کرنے میں ثابت قدم ہوتے ہیں۔ چونکہ جنگ کے وقت یہ افیم کے نشہ میں ہوتے ہیں۔ وہ انہیں اس قدر نشہ میں رکھتی ہے کہ لڑتے وقت انہیں اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں ہوتی ہے۔ وہ ہر قسم کا گوشت کھاتے ہیں' سوائے گائے کے۔ ان کے ہاں شراب بھی منع نہیں ہے۔ جنگ کے معاملہ میں اس قوم کو بہادر مانا جاتا ہے اور دوسرے لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ لیکن امن کے زمانے میں انہیں کوئی نہیں پوچھتا کیونکہ محلات اور کیمپوں میں یہ مغلوں اور دوسرے ہندوستانیوں کا شان و شوکت میں مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔

جب ایک راجپوت مرتا ہے تو اس کی بیویاں (یا بیوی' کیونکہ اگر اسے سچی محبت ہوتی ہے تو صرف ایک شادی کرتا ہے) خود کو زندہ جلا لیتی ہیں' یہ رسم بنیوں اور کھتریوں میں بھی ہے۔ آگرہ میں ستی کے یہ واقعات ہفتہ میں دو یا تین مرتبہ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی خوشگوار نظارہ نہیں ہوتا ہے مگر میں نے بطور تجسّس اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ہمارے گھر کے قریب ایک عورت نے اپنے شوہر کے مرنے کے فوراً بعد یہ اعلان کیا کہ وہ ستی کی خواہش مند ہے۔ اس نے یہ اعلان اس رنج و غم کے عالم میں کیا کہ جو شوہر کی وفات کی وجہ سے تھا۔

ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی مرتا ہے تو اس کی روح اس کی ناک کے راستے سے نکل کر اپنی ذات کے لحاظ سے کسی دوسرے شخص کی شکل میں دوبارہ سے اس دنیا میں آتی ہے۔ اگر کسی نے گناہ گار کے طور پر زندگی گذاری ہوتی ہے تو پھر اس صورت میں اس کا دوسرا جنم جانوروں' پرندوں' یا کیڑوں مکوڑوں کی شکل میں بطور سزا کے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی جانور کو نہیں مارتے ہیں۔ تاکہ اس کے اندر جو روح ہے اسے تکلیف نہ ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ جس جانور کو ہم تکلیف دیں اس میں ہمارے ماں' باپ' بہن بھائی یا بچوں کی روح ہو اور جو شاید اپنے گناہوں کی وجہ سے مرنے کے بعد جانوروں کے جسم میں دوبارہ سے پیدا ہوئے ہوں۔

میں ستی کا ذکر کر رہا تھا کہ جب کوئی عورت ستی ہونے کا ارادہ کر لیتی ہے تو پھر اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کے لئے یہ ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اس کے ارادے سے باز رکھیں۔ وہ کوشش ضرور کرتے ہیں' مگر جب وہ ثابت قدم اٹھتی ہے تو پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ روزمرہ کے معمولات کے مطابق غسل کرتی ہے' اپنے بہترین کپڑے اور قیمتی زیورات پہنتی ہے اور خود کو اسی طرح سے آراستہ کرتی ہے کہ جیسے یہ اس کا شادی کا دن ہو۔ جس عورت کا میں نے ذکر کیا ہے وہ گانوں اور باجوں کے ساتھ گورنر کے محل میں گئی تاکہ اس سے اجازت نامہ حاصل کرے۔ گورنر نے اسے کئی دلائل دئے کہ اس طرح جل کر مرنا گناہ ہے اور یہ کہ شیطان نے اسے اپنی تباہی پر اکسایا ہے۔ چونکہ وہ 18 سال کی نوجوان خوبصورت عورت تھی اس لئے گورنر نے پوری کوشش کی کہ وہ اس ارادے سے باز آ جائے۔ یہاں تک کہ اس نے اسے 500 روپیہ سالانہ کے وظیفہ کی پیش کش کی کہ جو اسے پوری زندگی ملے گا۔ لیکن ان سب باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے پرزور طریقہ سے کہا کہ وہ غربت سے نہیں ڈرتی ہے بلکہ اسے اپنے شوہر سے محبت ہے' اس لئے اگر بادشاہ کا پورا خزانہ بھی دیدیا جائے تو وہ اسے اپنے ارادے سے نہیں روکے گا کیونکہ بغیر شوہر کے یہ تمام خزانہ بیکار ہے۔ یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ کیونکہ وہ پہلے ہی کافی وقت لے چکی تھی۔ اور اب گورنر کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اسے اجازت دے' کیونکہ بادشاہ کا یہ حکم ہے کہ اگر کوئی ستی ہونے پر تیار ہو' تو اسے روکا نہ جائے' اس لئے اس نے اسے اجازت دیدی۔ اجازت ملنے پر وہ تیزی سے روانہ ہوئی' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کو دیر ہو گئی ہے اور جلدی سے اس جگہ پہنچی کہ جہاں اسے جلنا تھا۔ یہ جگہ شہر سے باہر ہے' یہاں ایک جھونپڑی بنی ہوئی ہے جس پر چھپر پڑا ہے اس وقت اسے پھولوں سے سجایا ہوا تھا۔ یہاں اس نے اپنے زیورات اتارے اور انہیں اپنی سہیلیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد اپنا لباس بھی دوسروں کو دیدیا' اور خود معمولی لباس میں رہی۔ پھر اس نے

ایک مٹھی چاول لئے اور انہیں وہاں کھڑے لوگوں میں تقسیم کیا۔ اس کے بعد وہ آخری بار اپنی سہیلیوں سے ملی اور انہیں الوداع کہا۔ آخری وقت میں اس نے اپنے ایک سال کے بچہ کو پیار کیا اور پھر اسے بھی ایک دوست کے حوالہ کیا۔ پھر وہ دوڑتی ہوئی اس جھونپڑی میں گئی کہ جہاں اس کے شوہر کی لاش تھی' وہ اس کے مردہ جسم سے بغل گیر ہوئی اور اسے بوسہ دے کر جلتی ہوئی آگ اٹھا کر لکڑیوں کے ڈھیر پر لگا دی' اس موقع پر لوگوں نے جھونپڑی کے دروازہ پر خشک لکڑیاں ڈال دیں اور زور زور سے رام رام کہنے لگے۔ وہ اس وقت تک شور مچاتے رہے جب تک کہ انہیں یقین نہ ہو گیا کہ وہ جل چکی ہو گی۔ دونوں کے جلنے کے بعد ہر ایک نے تھوڑی تھوڑی راکھ اٹھائی کیونکہ یہ اسے پاک سمجھتے ہوئے اسے محفوظ رکھتے ہیں۔ اس رسم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کی عورتوں کو اپنے شوہروں سے ہماری عورتوں سے زیادہ محبت اور وفاداری ہوتی ہے۔ وہ عورتیں کہ جو ستی نہیں ہوتی ہیں' تو ان کو اس قدر برا بھی نہیں سمجھا جاتا ہے جیسا کہ اکثر مصنّفین لکھتے ہیں۔ ان کے زندہ رہنے پر ان کی ذات برادری بہت زیادہ انہیں برا بھلا نہیں کہتی ہے۔

آگرہ میں مسلمانوں کی ایک شادی

شادی بیاہ کے معاملہ میں لڑکے اور لڑکی کو اپنی پسند کا کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے۔ یہ انتخاب ان کے والدین کرتے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو پھر یہ ذمہ داری رشتہ داروں اور دوستوں کی ہوتی ہے۔ جب لڑکے کی عمر 15 سے 18 سال کی ہو جاتی ہے تو اس کے دوست' رشتہ داروں اور دوستوں کے خاندانوں میں اس کے لئے لڑکی تلاش کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا اطلاق امراء پر ہوتا ہے غریبوں پر نہیں کیونکہ ان کے ہاں فوجی کی شادی فوجی گھرانہ اور تاجر کی شادی تاجروں کے گھرانہ میں ہوتی ہے' یہی حال دوسرے پیشوں کا ہے۔ اگر انہیں کوئی مناسب رشتہ نہیں ملتا ہے تو وہ شادی کرانے والوں سے رجوع کرتے ہیں جو کہ تمام مناسب رشتوں کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں۔ انہیں لڑکے کا والد اپنے گھر بلا کر ان سے دریافت کرتا ہے کہ کیا اس کے لڑکے کے لئے کسی امیر خاندان کی کوئی لڑکی ہے؟ شادی کرانے والے یہ ایجنٹ اس کو ایک نہیں بلکہ 25 لڑکیوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ جب لڑکیوں کے خاندان اور ان کی موجودہ حالت کے بارے میں پوری طرح سے تفتیش کر لی جاتی ہے تو پھر ان میں سے ایک کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد منتخب شدہ لڑکی کے گھر لڑکے والے جاتے ہیں۔ چاہے ان کی اس خاندان سے پہلے سے واقفیت ہو یا نہ ہو' اور وہاں جا کر شادی کی پیش کش کرتے ہیں۔ اس بات چیت میں کچھ دن کا وقفہ ہوتا ہے۔ اگر لڑکی والے فوراً راضی ہو جاتے ہیں تو دولہا کی جانب سے ایک انگوٹھی بطور تحفہ بھیجی جاتی ہے۔ اس کے جواب میں دلہن کی طرف سے پان اور رومال یا اسی قسم کی کوئی چیز بطور تحفہ آتی ہے۔ بدقسمت شوہر کو اس کا قطعی موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ

اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھ سکے اور جان سکے کہ کیا وہ کالی ہے یا گوری' سیدھی ہے یا کبڑی' خوبصورت ہے یا بدصورت۔ اس کے لئے اسے اپنی ماں اور خاندان کی دوسری عورتوں کے بیانات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد سے گھر میں خوشی کی محفلیں شروع ہو جاتی ہیں۔ رقص و موسیقی کے ساتھ خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اور دوستوں سے مبارک باد وصول کی جاتی ہے۔ دونوں گھرانوں میں شادی کے موقع پر شادیانے بجائے جاتے ہیں کہ جس سے اس قدر شور ہوتا ہے کہ اہل محلّہ اس سے تنگ آ جاتے ہیں۔

شادی کا دن منگنی کے 15 یا 20 دن کے بعد طے کیا جاتا ہے تاکہ شادی کی تیاری ہو سکے۔ شادی سے تین یا چار دن پہلے دولہا کے گھر والے دلہن کے ہاں جاتے ہیں۔ اس میں ان کے گھر والے' رشتہ دار اور دوست سب ہی ہوتے ہیں' اپنے ساتھ یہ خوبصورت پلیٹوں میں مٹھائی' خشک میوہ' اور موسمی پھل لے کر جاتے ہیں۔ 100 سے 1000 روپیہ تک کی نقدی بھی ان تحائف میں شامل ہوتی ہے۔ یہ روپیہ دولہن کے گھر والوں کے کام آتا ہے جو اس سے شادی کی تیاری کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دولہن کو زیورات بھی دیئے جاتے ہیں۔ یہ جلوس بینڈ باجے اور رقص و موسیقی کے ساتھ دولہن کے گھر جاتا ہے جہاں مہمانوں کی شام کو دعوت کی جاتی ہے۔

دوسرے دن شام کو دولہن والے بھی جلوس' بینڈ باجے اور روشنیوں کے ساتھ دولہا کے گھر آتے ہیں۔ وہ دولہا کے لئے کاغذ' کپڑے' اور سائن کی بنی ہوئی چیزیں جیسے کشتی اور جہاز لاتے ہیں کہ جن پر نقش و نگار بنے ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں چھت پر رکھ دی جاتی ہیں یہاں تک کہ موسم اور ہوا سے یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر عورتیں دولہا کے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگاتی ہیں۔ یہ رسم مہندی کہلاتی ہے۔ مہمان یہاں سے رات کا کھانا کھا کر جاتے ہیں۔ دوسرا دن شادی کا دن ہوتا ہے۔

شادی کے دن دولہا کو سرخ لباس پہنایا جاتا ہے اور اس کی سہرا بندھائی کی رسم

ہوتی ہے، سہرے کی وجہ سے اس کا چہرہ چھپ جاتا ہے۔ شام کو شادی کا جلوس یا
برات معہ رشتہ داروں اور دوستوں کے ہمراہ جلوس کی شکل میں دلہن کے گھر جاتی
ہے۔ دولہا گھوڑے پر سوار ہوتا ہے جب کہ اس کے دوست پیدل یا گاڑیوں میں
ہوتے ہیں۔ عورتیں پالکیوں میں جاتی ہیں۔ شادی سے پہلے رقص و موسیقی کا انتظام
ہوتا ہے۔ خاص طور سے گانے کے لئے جن عورتوں کو بلایا جاتا ہے انہیں لولونی کہا
جاتا ہے یہ ان طوائفوں کی اولادیں ہیں کہ جو ایران سے ہندوستان آئیں تھیں۔ یہ
فارسی میں گانے گاتی ہیں۔ ان کے برعکس ڈومنیاں ہندوستانی زبان میں گاتی ہیں، ان
کے گیت فارسی سے زیادہ خوبصورت، دل لبھانے والے، اور خوبصورت ہوتے ہیں
چونکہ ان کے گانوں میں زیادہ ترنم اور دھنیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا عورتیں ان کی دھنوں پر
رقص بھی کرتی ہیں۔ ایک پہر رات گذرنے کے بعد قاضی آتا ہے اور وہ نکاح پڑھا
کر، دولہا، دلہن کو ایک بندھن میں باندھ دیتا ہے۔ اس کے بعد کھانا اور پھر پوری
رات رقص و موسیقی جاری رہتی ہے صبح کے وقت وہ دولہن اور اس کے جہیز کے
ساتھ رخصت ہو جاتے ہیں۔ دولہا گھر پہنچ کر پہلی بار اپنی بیوی کو دیکھتا ہے۔ اگر وہ
خوبصورت ہو تو خود کو مبارک باد دیتا ہے۔ دولہا و دلہن کو فوراً ایک کمرے میں پہنچا دیا
جاتا ہے تاکہ وہ وہاں باہمی ملاقات کر لیں۔ اس دوران میں عورتیں کمرے کے باہر
انتظار کرتی ہیں اور جب دولہا فارغ ہو کر باہر آتا ہے تو عورتیں کمرے میں جا کر جانچ
پڑتال کرتی ہیں۔ اور پھر جیسے کہ دولہا فتح یاب ہو گیا ہو، یہ سب ایک دوسرے کو
مبارک باد دیتی ہیں۔ اگر دولہا کسی وجہ سے ناکام ہو جائے تو عورتیں اسے بطور طنز
چرخہ بھیجتی ہیں۔

یہاں میں نے جو کچھ شادی کے بارے میں بیان کیا ہے کہ ہندوستانی رسم ہے
مغلوں اور ہندوؤں کے ہاں اس میں ذرا اختلاف ہوتا ہے۔ ہندوؤں میں اکثر شادی
بچپن ہی میں کر دی جاتی ہے۔ اگر بلوغت سے پہنچتے پہنچتے لڑکا مر جائے تو بیوہ لڑکی
شادی نہیں کرتی ہے اور کنواری کی حیثیت سے مرتی ہے اگر وہ اپنی تسکین کے لئے

کوئی خفیہ حربے استعمال نہ کرے۔ تو۔ مرد چاہے جتنی شادیاں کر سکتے ہیں بوڑھے آدمی بھی چھوٹی لڑکیوں سے شادی کرتے ہیں' کیونکہ بچپن کی شادی کی وجہ سے انہیں نوجوان عورتیں ملتی ہی نہیں ہیں۔

خاتمہ

یہ اس ملک کے لوگوں کی عادات' اطوار' انتظام اور رسم و رواج کا ایک خاکہ ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ جتنا حقیقت سے قریب ہو' اسے بیان کروں لیکن میں نے جو کچھ بیان کیا ہے نہ تو یہ حتمی ہے اور نہ پورے ملک پر صادق آتا ہے کیونکہ اس ملک میں بہت زیادہ اختلافات ہیں' انواع و اقسام کی روایات ہیں اور لوگوں کے مذاق میں بہت فرق ہے۔ ان کے طبقہ اعلیٰ اور عوام میں اس کو فرق بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی یہ کہے کہ اس ملک میں ہر چیز یکساں ہے تو اس کی اس غلطی کو فوراً پکڑ لینا چاہئے۔ اس کے علاوہ جان بوجھ کر میں نے ایسی بہت سی باتوں کو چھوڑ دیا ہے کہ جن کا تعلق اس رپورٹ سے نہیں بنتا تھا' جیسے کہ اس ملک کے باشندوں کی اصلیت' ان کی عادات و اطوار' ان کے لباس' اور ان کا جنگ کا طریقہ وغیرہ۔ چونکہ میرا اہم مقصد یہ ہے کہ میں اپنی کمپنی کے صاحب اقتدار لوگوں کو اس ملک کی تجارت کے بارے میں معلومات فراہم کروں' اس لئے میں نے اس پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔ میں اس بات کو بھی ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میں ہندوستان میں خاموش تماشائی کی طرح نہیں رہا بلکہ ان کے معاشرے اور لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنی رپورٹ کو ان خواہشات کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ میرے سرپرست تجارت و کاروبار میں ترقی کریں' اور مستقبل میں کامیابی و خوش حالی کو حاصل کریں۔

تشریحات

تجارتی کوٹھی:

یورپین تاجروں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں جنہیں وہ فیکٹری کہتے تھے' یہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر بنائیں تھیں۔ مگر بعد میں یہ دوسرے اہم شہروں میں بھی قائم کی گئیں۔ یہ ایک قلعہ نما مکان ہوتا تھا کہ جس میں وہ سامان جو یورپ بھیجا جاتا تھا اور جو یورپ یا جنوب مشرقی ایشیا سے آتا تھا' اسے یہاں رکھا جاتا تھا۔ کوٹھی کی حفاظت کے لئے یورپی کمپنی اپنے فوجی رکھتے تھے۔ اسی کوٹھی میں ان کا عملہ بھی رہا کرتا تھا۔ آگے چل کر کوٹھی کے حفاظتی دستے ہی بڑھ کر ایک چھوٹی فوج بن گئے۔

فیکٹر:

یہ تجارتی کمپنی کا ادنی عہدے دار ہوتا تھا۔ اس کا کام ہوتا تھا کہ یہ اس صوبہ میں کہ جہاں کوٹھی ہے وہاں گھوم پھر کر کاریگروں سے مال تیار کرائے اور تاجروں سے مال خریدے۔ جب اس کو ترقی ملتی تھی تو یہ سینئر فیکٹر ہو جاتا تھا۔

عامل:

مغل صوبہ کے گورنر کو کہتے تھے۔ اس کا کام صوبہ کے انتظام کو سنبھالنا اور چلانا ہوتا تھا۔

کوتوال:

شہر کے انتظامات اور امن و امان کو برقرار رکھنا اس کے فرائض میں تھا۔

قاضی:

یہ مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا۔

فوجدار:

فوج کا انچارج۔ اس کا عہدہ عامل کے برابر ہوتا تھا۔

غسل خانہ:

وہ جگہ کے جہاں بادشاہ خاص خاص امراء سے ملتا تھا۔ یہ نجی محفلوں کے لئے بھی مخصوص تھا۔